دِلّی

*

کے

پنجابی سوداگران

ناشر

ادارہ تحقیق و تاریخ پنجابی سوداگران دہلی
۵۴۔ دہلی کالونی۔ نمبر ۱، چودھری خلیق الزمان روڈ کراچی ۶

جملہ حقوق بحقِ مؤلف محفوظ ہیں

نگرانِ اشاعت
شیخ محمد الیاس لاہور والا
سید رشید الحق وارثی
شیخ ناصر الیاس پریس والے
شیخ احمد سعید محمد دین بھولا والے

بار اول	ایک ہزار
سنہ طباعت	۱۹۸۴ء
مطبوعہ	مشہور آفسٹ پریس ۔ کراچی
قیمت	
کتابت	حسین احمد

ملنے کا پتہ

پاک اکیڈمی، دوکان ۲۲ مسجد باب الاسلام، آرام باغ ۔ کراچی

انتساب

برادری کے ہر اس فرد کے نام جس کو

- اپنے شاندار ماضی پر فخر ہے
- اپنے تابندہ حال کا ادراک ہے

اور

- درخشندہ مستقبل سے دلچسپی ہے

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱	مقدمہ از مسرور احمد توقیر صدیقی	
۲	پیش لفظ از عطاء الرحمٰن مؤلف کتاب ہٰذا	
۳	فہرست مآخذ	
	پہلا باب	۲۷
۱	سپتہ، سندھو پنجند یا قدیم پنجاب	
۲	حدود اربعہ	
۳	برصغیر کے تجارتی حالات	
۴	قدیم پنجاب کا تجارتی انحطاط	
۵	وادیٔ پنجند یا قدیم پنجاب کے پنجابی سوداگراں یا تجارت پیشہ لوہانے	
۶	دلی کے پنجابی سوداگران کے اجداد کا قبول اسلام	
۷	تذکرہ پیر کبیر الدین حسنؒ	
۸	دلی کے پنجابی سوداگراں کا خوجہ کہلانا، شیخ بنیا اور شمسی کا لقب اختیار کرنا۔	

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۹	پنجاب کے سماجی و معاشرتی حالات اور زبان	
۱۰	**دوسرا باب**	۶۳
۱۱	دلی کے پنجابی سوداگران کا پنجاب سے ترک مکانی	
۱۱	قدیم پنجابی سوداگران کی دہلی میں آمد	
۱۲	دہلی کے معاشرتی حالات	
۱۳	دہلی کا تذکرہ	
	تیسرا باب	۹۰
۱۴	دہلی کے خاص خاص بازار، عمارتیں اور تاریخی	
۱۵	مقامات	
۱۵	دلی کے پنجابی سوداگراں کی پاکستان میں آمد	
	چوتھا باب	۱۳۴
۱۶	تذکرۃ الرجال	

فہرست ماخذ

نمبر شمار

١ تاریخ قوم پنجابی سوداگران از نسیم احمد باغپتی
پنجابی سوداگر یوتھ لیگ کراچی

٢ زوال ملّت اسلامیہ
از مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
ذوالنورین اکادمی بھیرہ ضلع سرگودھا

٣ آئینۂ حقیقت نُما
از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
نفیس اکادمی اسٹریچن روڈ کراچی

٤ یادرفتگاں از سلطان رفیع
جمعیت پنجابی سوداگراں دہلی رجسٹرڈ

٥ تاریخ اسلام تین جلد
از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
نفیس اکادمی اسٹریچن روڈ کراچی

٦ حجۃ اللہ البالغہ از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی

٧ معیار العلماء از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
عمران اکیڈمی لاہور

٨ عہد بنگش کی سیاسی علمی تاریخ
از پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری
ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد کراچی

٩ مخدوم جہانیاں جہاں گشت
از پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری
ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد کراچی

١٠ علم و عمل وقائع عبدالقادر خانی
از پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری
ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد کراچی

١١ جنگ آزادی از پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری
پاک اکیڈمی ١٤١/١ وحید آباد کراچی

١٢ فتح سندھ عرف چچ نامہ
از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ
سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد (سندھ)

١٣ نقشِ حیات از مولانا حسین احمد مدنی
فرزند توحید توحید اکیڈمی کراچی

١٤ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
از مولانا ابوالحسن علی ندوی
مجلس نشریات اسلام ناظم آباد

۱۵ آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد
مقبول اکیڈمی کراچی

۱۶ تمدن ہند، موسیولیباں ترجمہ غلام علی آزاد بلگرامی
بک لینڈ بندر روڈ کراچی

۱۷ تمدن عرب موسیولیباں
ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

۱۸ منتخب التواریخ
از علامہ عبد القادر بدایونی
ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی

۱۹ آب کوثر، رود کوثر، موج کوثر
از محمد اکرام (ستارہ پاکستان)
ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ۔ لاہور

۲۰ تاریخ سندھ المعروف تاریخ معصومی
از میر محمد معصوم بکھر ترجمہ اختر رضوی
سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد سندھ

۲۱ تزک بابری
از ظہیر الدین بابر
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۲۲ جغرافیہ قرآنی
از عبد الماجد دریا آبادی
مکتبہ بنوریہ نیوٹاؤن کراچی

۲۳ تزک جہانگیری

۲۴ عمدۃ التواریخ

۲۵ مقدمہ ابن خلدون
از مولانا سعید حسن خان یوسفی
نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی

۲۶ افغانوں کی نسلی تاریخ
از روشن خان
روشن خان اینڈ کمپنی جونا مارکیٹ کراچی

۲۷ تاریخ ہندوپاک
از شکیل احمد ضیاء

۲۸ آثار الصنادید
از سرسید احمد خان
پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی

۲۹ تاریخ ہندو پاک
از ایشوری پرشاد
میسرز عطر چند کپور۔ لاہور

۳۰ مآثر الامراء
از پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

۳۱ اکابر قوم
از مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی
پاک اکیڈمی آرام باغ کراچی

۳۲ البیرونی اور جغرافیہ عالم
از مولانا ابوالکلام آزاد
اردو اکیڈمی سندھ

۳۳ قصص القرآن
از مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
۳۴ ندوۃ المصنفین دہلی

۳۴ مسلمان ہند و پاکستان کی تاریخ تعلیم
از مفتی انتظام اللہ شہابی
ایجوکیشنل ریسرچ سوسائٹی ناظم آباد کراچی

۳۵ تاریخ پنجاب
از اقبال صلاح الدین
سنگ میل پبلی کیشن لاہور

۳۶ طبقات ناصری ۳ جلد
از غلام رسول مہر
مرکزی اردو بورڈ لاہور

۳۷ تاریخ ملتان ۲ جلد
از مولانا نور احمد فریدی
قصر الادب رائٹرز کالونی ملتان

۳۸ واقعات دار الحکومت دہلی
از مولوی بشیر الدین
آگرہ

۳۹ تاریخ سندھ
از مولانا ابوظفر ندوی
دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

۴۰ تاریخ ارائیاں
از اصغر علی چودھری
علمی کتب خانہ اردو بازار لاہور

۴۱ دو صوفی
از میاں اخلاق احمد

۴۲ تاریخ پنجاب
از کنہیا لال

۴۳ تاریخ پنجاب
از محی الدین

۴۴ فرحت الناظرین
از پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری
ایجوکیشنل کانفرنس ناظم آباد کراچی

۴۵ بھگت مال
از تلسی داس
مطبع نولکشور لکھنؤ

۴۶ ہری ادم
از منشی ہر نرائن داس
مطبع نولکشور لکھنؤ

۴۷ جین پرچارک
از لالہ موتی پرشاد
مطبع نولکشور لکھنؤ

۴۸ گینش بیلا پراگ
از یوگ یشتھ
مطبع نولکشور لکھنؤ

۴۹ الحیات بعد الممات
از مولانا تفضل حسین بہاری
مکتبہ ایوبیہ محمدی مسجد برنس روڈ کراچی

۵۰ اخبار الاخیار
از مولانا عبدالحق محدث دہلوی
مدینہ پبلشنگ ہاؤس کراچی

۵۱ سوانح عمر علامہ راشد الخیری
از مولانا رازق الخیری
ماہنامہ عصمت کراچی

۵۲ آئین اکبری
از علامہ ابوالفضل
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۵۳ سرائیکی زبان کا ارتقاء
از محمد بشیر احمد بہاولپوری
مرکزی سرائیکی نے ادب بہاولپور

۵۴ ہسٹری آف پنجاب
از اکرام ملک
ریسرچ سوسائٹی آف پنجاب

۵۵ جدید تاریخ ہند
از میلا رام چدہ جلالپوری
میسرز عطر چند کپور لاہور

۵۶ پنجاب انڈر دی سلطانہ
از بخشش سنگھ نجار
مطبع اسلامیہ سعودیہ لاہور

۵۷ تذکرہ صوفیائے پنجاب
از اعجاز الحق قدوسی

۵۸ ہسٹری آف دی اسمائیلیز از پیکلے

۵۹ کتاب المعارف
ترجمہ سلام اللہ صدیقی
پاک اکیڈمی کراچی

جن ۵۹ کتب کے نام بطور ماخذ درج کئے جا رہے ہیں ان کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ اتنی اہم کتب کی ایسی معقول تعداد اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دلی کے پنجابی سوداگراں کی یہ برادری اتفاقات زمانہ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ برصغیر کی تاریخ میں اس کی جڑیں گہری ہیں۔ اس کا مقام بڑا نمایاں ہے اور اس کی خدمات بڑی اہم اور تاریخ ساز ہیں۔ اس سے ایک نتیجہ خود بخود

سامنے آتا ہے کہ یہ برادری ورثہ میں جو صلاحیتیں نسل نو کو منتقل کر رہی ہے وہ اس مملکت خداداد پاکستان کو مختلف شعبۂ ہائے حیات میں بالخصوص سیاست ومعیشت اور سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر دیں گی گویا مستقبل میں بہترین توقعات اس برادری سے وابستہ کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ ارباب برادری وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے نسل نو کی طرف متوجہ ہوں ؛

مقدمہ

تاریخ علم وادب کی وہ شاخ ہے جس کا تعلق انسانی فکر وعمل کے اس دور سے ہوتا ہے جو گزر چکا ہے ۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی اور تنزل دونوں سے واسطہ پڑتا ہے اور یہ انسانی تجربات کے دائرے سے خارج نہیں ہوتے ۔ یہ تجربات محفوظ کر لئے گئے ہوں سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہوں یا معدوم ہو گئے ہوں اور اہل نظر یا اہل تحقیق کے لئے کچھ نہ کچھ نشانیاں چھوڑ گئے ہوں سب بہر نوع تاریخ کا تانا بانا ہیں اور مطالعہ کرنے والے اپنی صلاحیتوں اور ماحول کے مطابق ان کو سمجھتے ہیں اور نتائج اخذ کرتے ہیں اور ان کے اسباق سے حال کو بہتر اور مستقبل کو تابناک بنانے کی سعی کرتے ہیں چونکہ تحقیق کا عمل ایک ایسی سعی ہے جس کو مکمل نہیں کہا جا سکتا ، اس لئے اس میں مزید تحقیق کے امکانات ہوتے ہیں ۔

تاریخ کی بنیاد نہ قیاس ہے نہ احتمال بلکہ وہ حقائق ہیں جو ماضی میں گذر چکے ہیں ۔ واقعات معمولی ہوں یا غیر معمولی بہر صورت تاریخ کا

حصہ ہوتے ہیں کوئی واقعہ وقت اور تسلسل کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا اور کسی بھی واقعہ کو جب تک سیاق و سباق کے ساتھ اور جزئیات کو شامل کر کے بیان نہ کیا جائے قاری کی فہم میں واضح طور پر جاگزیں نہیں ہوتا۔ تاریخ دراصل ایک میزان ہے جس پر خوبیوں اور خامیوں کو پرکھ کر معاشرے کو بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاریخ کی کسی معاشرے میں وہی حیثیت ہوتی ہے جو یادداشت کی ایک فرد کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب ایک فرد اپنی یادداشت کھو بیٹھتا ہے تو وہ ماحول سے الگ ہو جاتا ہے اور کوئی معاشرہ اپنی تاریخ کو بھلا دیتا ہے تو وہ بھی ماحول سے کٹ جاتا ہے۔

پوری بنی نوع انسان کی تاریخ لکھنا تو ممکن ہی نہیں اور نہ ہی کوئی ایسا مورخ نظر سے گزرا ہے۔ ہاں ہم جب تاریخ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو دنیا کے بے شمار معاشروں میں سے کسی ایک معاشرے کی تاریخ ایک محدود دور سے متعلق لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس معاشرے کی سرزمین کی جغرافیائی کیفیات بھی اس کا لازمی جز ہوتی ہیں اور یہ نظریہ قائم کرنا پڑتا ہے کہ جغرافیائی کیفیات اس کے تمدن، رہن سہن اور معیشت اس معاشرے پر کس طرح اثرانداز ہوتے ہیں، پس کسی علاقے، قوم یا برادری کی تاریخ مرتب کرتے وقت جو امور ذہن میں رہنے چاہئیں وہ جغرافیائی حدود کا علم اور آب و ہوا آبادی، معاشرت، معیشت، زبان، رہن سہن وغیرہ کے کوائف ہیں۔ اس کے علاوہ آثار قدیمہ کا علم اور علم ترتیب واقعات بھی ضروری ہیں۔

دلی کے پنجابی سوداگران کی تاریخ کی ترتیب دراصل ایک بڑا

مشکل مرحلہ تھا۔ اسکی تاریخ کے اجزاء بکھرے ہوئے تھے اور صدیوں پر محیط تھے جن کی تلاش از خود ایک صبر آزما اور کاوش طلب کام تھا جس کے لئے مستقل مزاجی، بصیرت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے دراصل تحقیق کا عمل خود ھی ایک ایسی مہم ہے جو وقت چاہتی ہے اور جس میں ایسے مراحل آتے ہیں کہ بڑے بڑے حوصلہ مند ہمت ہار جاتے ہیں اور جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

کوئی منصوبہ بڑا ہو یا چھوٹا اس پر عمل کرنے کا ارادہ ذہنوں کی پیداوار ہوتا ہے لیکن اس کی تکمیل ہر شخص کا حصہ نہیں ہوتا۔ کہیں تو یہ ارادہ ذہن میں جتنی جلدی ابھرتا ہے اتنی ہی جلدی دم توڑ دیتا ہے اور کہیں اس میں کسی قدر پیش رفت ہوتی ہے اور پھر آگے بڑھنے کی راہیں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

جناب عطاء الرحمٰن صاحب کے ذہن میں " دلی کے پنجابی سوداگران " کی تاریخ لکھنے کا منصوبہ اُبھرا، ارادہ استوار ہوا اور لگن نے اس میں غیر معمولی قوت پیدا کی۔ آغاز ہوا اور چھ سال کی مدت تک صاحب موصوف تحقیقی عمل میں مصروف رہے۔ بزرگوں کی روایات، احباب سے مشورے اور کتابوں کا مطالعہ غرض کہ انھوں نے ہر وہ قدم اُٹھایا جو لازمی تھا اور حصول مقصد میں محد و معاون تھا، اللہ تعالیٰ خلوص دل سے کوشش کرنے والوں کو ناکام نہیں کرتا بلکہ کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے بالآخر موصوف کی انتھک اور طویل کوششیں رنگ لائیں اور یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور یہ کتاب مختلف مراحل سے گذر کر کندن بن کر نکلی اور اب اہل نظر کے کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

ایک مورخ کے کردار کی انتہائی بلندی یہ ہے کہ وہ واقعات
کو ضبط تحریر میں لاتے وقت خوبیوں اور خامیوں دونوں کے ساتھ
پورا پورا انصاف کرے ورنہ یہ کاوش یک طرفہ ہو کر رہ جائے گی اور
حقائق سے دور اور دور ہوتی جائے گی جناب عطاء الرحمٰن صاحب
میں بہ حیثیت ایک مورخ یہ خوبی بڑی روشن ہے ۔ یہ کتاب چار ابواب
پر محیط ہے اور قدیم دور سے لے کر جدید زمانے تک واقعات کا تسلسل
برقرار ہے ۔ جہاں اہم واقعات لکھے گئے ہیں وہاں جزئیات کو بھی نظر انداز
نہیں کیا گیا اور اس حقیقت سے یہ کتاب ایک مکمل تاریخ ہے ۔۔۔۔
حتی الامکان تمام حالات واقعات کو احاطہ کرنے کی پوری پوری کوشش
کی گئی ہے پھر بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ واقعات تک دسترس نہ ہو سکی ہو
اور رہ گئے ہوں جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ کوئی بھی تحقیق مکمل
نہیں کہی جا سکتی ہے ۔ یہ ایسا باب ہوتا ہے جو اہل تحقیق کے لئے کھلا رہتا
ہے ۔ اور جیسے جیسے نئے کوائف دریافت ہوتے ہیں ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔
لیکن ہر حال میں نقش اوّل نقش اوّل ہی ہوتا ہے اور اس کی کیفیت
ایک عمارت کی بنیاد کی سی ہوتی ہے جس پر کھڑی ہوئی عمارت میں اضافہ
تو ہوتا رہتا ہے لیکن بنیاد وہی رہتی ہے ۔
جناب عطاء الرحمٰن صاحب نے یہ تاریخ لکھ کر بہت بڑا کارنامہ
انجام دیا ہے اور ان کا یہ کارنامہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے یادگار
رہے گا ۔ رب جلیل موصوف کو عمر دراز اور ہمت اور حوصلہ عطا کرے کہ وہ اسی
قسم کے اور جواہر پارے منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوں ۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

توقیر صدیقی ۳۰ $\frac{۱۰}{۸۴}$

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

پنجابی سوداگران دو لفظوں "پنجابی" اور "سوداگران" کا مرکب ہے اور
لفظ "پنجابی" دو لفظوں "پنج" اور "آب" سے مل کر بنا ہے ۔ پنجابی
بمعنی پانچ اور آب بمعنی پانی ۔ اس طرح پنجابی کا مطلب پانچ
دریاؤں کی سرزمین ہوا ۔ سوداگر بمعنی سودا کرنے والا یا تاجر ہے ۔
پس پنجابی سوداگران سے مراد ایسے تجارت پیشہ اصحاب ہیں جنکا
تعلق پنجاب سے ہے ۔ جب ہم " دہلی کے پنجابی سوداگران " کہتے ہیں تو
ہماری مراد دہلی سے وابستہ ایک ایسی تجارت پیشہ برادری کے اُن افراد
سے ہوتا جس کا تعلق قدیم پنجاب سے ہے یا جن کے آباؤ اجداد قدیم پنجاب
میں رہتے تھے ۔ اور وہیں تجارت کرتے تھے اور نقل مکانی کرکے دہلی میں
آگئے تھے ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قدیم پنجاب کونسا علاقہ تھا اور اس
کا حدود اربعہ اور جغرافیائی اہمیت کیا تھی یہ لوگ پنجاب سے نقل مکانی
کرکے دہلی کیوں اور کب آئے اور ان کی تاریخ کیا ہے ماضی کا کھوج لگانا
اور ماضی سے اپنے رشتے کی کڑیاں ملانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے

اگر کوئی فرد، افراد، برادری یا قوم اپنے ماضی سے کٹ جائے تو پھر اس کی حیثیت ایک ایسی معلق شے کے مانند ہوتی ہے جو ہوا کے جھونکوں سے بلندی اور پستی میں اُڑتی رہتی ہے لیکن اُس کا قیام و مقام نہیں ہوتا۔

دہلی کے پنجابی سوداگراں ایسی معزز اور اہم برادری ہے جس میں تجارت پیشہ اور مختلف النوع پیشوں سے وابستہ افراد شامل ہیں۔ قدیم ایام میں اس معاشرتی برادری کے تمام اراکین تجارت پیشہ ہی تھے اور یہی وجہ تھی کہ یہ سوداگران برادری کے نام سے موسوم تھے۔

زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے رہے، اور اس میں شامل لوگوں نے اور پیشے بھی اختیار کرنے شروع کئے، اور یوں یہ معاشرہ جس کو تاجروں نے معاشی بنیاد پر استوار کیا تھا، ایک معاشرتی اکائی بن گیا۔ مگر زمانے کی دست بُردسے نا بچا اور طبقاتی کشمکش کا شکار ہو گیا، لیکن آج بھی دلی کے پنجابی سوداگراں کی بڑی تعداد تجارت پیشہ، مرفہ الحال اور دیندار لوگوں پر مشتمل ہے لیکن ان کے تاریخی حالات پر کوئی باقاعدہ اور مستند کتاب موجود نہیں۔ انیسویں صدی کے اختتام تک کسی نے اس اہم فریضہ کی طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے کوشش کی بھی ہو گی تو اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوئی ہوں گی۔ بیسویں صدی میں اس طرف توجہ ہوئی۔ چند انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ اخبارات اور رسائل جاری ہوئے۔ کچھ حالات اور شخصیات پر قلم اُٹھایا گیا۔ یہ دراصل تاریخ کی سمت ایک قدم تھا۔ محترم نسیم احمد صاحب باغپتی نے قیاس اور سماعی بنیادوں پر ایک مختصر کتاب تصنیف کی، جناب شیخ سلطان رفیع صاحب نے

شخصیات سے متعلق ایک مجلّہ "یادرفتگان" نکالا اور جناب انوارالحق حقی صاحب نے اپنے ماہنامے "قوم" میں کچھ واقعات و حالات پر روشنی ڈالی۔

میں اس برادری کے ایک فرد کی حیثیت سے اس میں غلطاں و پیچاں تھا اور کئی سال سے اپنی امکان بھر کوشش کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ قیاسات کا سہارا نہ لوں بلکہ تحقیق کی مدد سے ایک ایسی تخلیق پیش کروں جو اگر کامل نمونہ نہ بن سکے تو ایک ٹھوس بنیاد ضرور مہیا ہو جائے جس میں آئندہ کا محقق اپنی نئی دریافت کا اضافہ تو کر سکے لیکن میری اس کاوش کی اہمیت سے انکار نہ کر سکے۔ میں نے بہت کچھ مواد اکٹھا کر لیا تھا لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بناء پر یہ کام معرض التواء میں پڑا رہا۔ متذکرہ حضرات کی کاوشوں نے میرے لئے مہمیز کا کام کیا۔ البتہ ان نگارشات میں یہ بات تشریح طلب رہی کہ آیا یہ لوگ مسلم معاشرتی اصطلاحات کی رُو سے قوم ہیں یا برادری۔ میں اسی میں الجھا ہوا تھا کہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا فرمان "اپنا حسب و نسب چھپانے یا اس میں فرق کرنے والا اللہ تعالیٰ سے کفر کرتا ہے" ترمذی میں مندرج میری نظر سے گزرا اور میں نے ذاتی طور پر تحقیق و تفتیش کا سلسلہ شروع کیا۔

چھ برس تک صدیوں میں پھیلے ہوئے پنجابی سوداگراں کے طرز تجارت اور بود و باش کا ہر جہت سے مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ ہوا وہ یہ ہے کہ یہ لوگ نو مسلم ہندو، اسلامی معاشرے کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہیں اور یہ سماجی طور پر ایک عظیم وفاقی

برادری سے منسلک ہیں اور اس کا ہر فرد اپنے نام کے ساتھ
اپنی برادری کو ضرور ظاہر کرتا ہے۔

ان کی تاریخ سے متعلق اب تک جو کچھ عوام کے سامنے آیا ہے میں فی الوقت اس کے بارے میں کوئی اظہار خیال کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ بعض حضرات نے صرف قیاسات سے کام لیا ہے وہ اس کو نہ صرف تاریخ کا نام دیتے ہیں بلکہ اس سے تاریخ کے غیر مشتبہ واقعات اور متفقہ قومی روایات کی تردید کا کام بھی لیتے ہیں۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ بعض اوقات قیاس کو بھی درست تسلیم کرنا پڑتا ہے لیکن صرف قیاس کی بنیاد پر صدیوں پر پھیلی ہوئی کسی قوم کی متفقہ روایات کی تردید نہیں کی جاسکتی۔ اگر روایات کو صرف قیاسات کی بنیاد پر رد کیا جائے تو یقین رکھنا چاہیئے کہ دنیا کی بہت سی قوموں کے دامن میں تاریخ کا کوئی سرمایہ یا تمدن و تہذیب کی کوئی خوبی باقی نہیں رہے گی۔

ان میں نسلاً بعد نسلٍ چلی آنے والی روایت کو جب درایت کی کسوٹی پر پرکھا تو معلوم ہوا کہ وہ محض ایک حکایت ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے مطالعہ کا دائرہ وسیع کیا اور قدیم تاریخی کتابوں کی چھان پھٹک شروع کردی جن سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ قوم "لوہانہ" سے تعلق رکھتے ہیں جو تاریخ میں ہندوؤں کی ایک عظیم شخصیت رام چندر جی کے بیٹے "لوہ" کی نسل سے متعلق بیان کئے جاتے ہیں اور راجہ "لوہ" کے متعلق ماہرین انساب کا

کہنا ہے کہ اس کا سلسلۂ نسب حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام سے پچیسویں پشت میں جا ملتا ہے، چنانچہ اب مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ دلی کے پنجابی سوداگران نسلاً آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام کی اولاد ہیں۔

قوم لوہانہ کو مشرف بہ اسلام کرنے والے مبلغین اسلام میں جن دو بزرگ شخصیتوں کے نام نامی تاریخ کی کتابوں میں نمایاں طور پر مرقوم ہیں ان میں (۱) پیر عبدالرزاق خانوادہ سید غوث محمد قادری گیلانی (پیران پیر سید عبدالقادر گیلانیؒ کی اولاد) (۲)
(۲) پیر کبیر الدین حسن جن کے دستِ بابرکت پر دلی کے پنجابی سوداگران کے اجداد اعلیٰ نے اسلام قبول کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اور جغرافیہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکہ ہر مقام کے جغرافیائی حالات نہ صرف اس جگہ کے باشندوں کے رسم و رواج، چال ڈھال اور عادت و اطوار پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ جس طرح زرخیز زمین تھوڑی محنت کے عوض بہت پیداوار دے کر علاقے کے لوگوں کو آرام پسند بنا دیتی ہے اور ریگستان علاقے یا پہاڑی مقامات پر مشقت کے باوجود تھوڑی پیداوار اور وہاں کے باشندوں کو سخت کوش بناتی ہے۔ اسی طرح پیداواروں سے بھرپور علاقے کم پانی اور وسائل سے بھرپور علاقے تجارت کی تحریص و ترغیب دیتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کے ساتھ جغرافیہ کا مطالعہ کرنے سے میرے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہ رہا کہ قدیم پنجاب کے پنجابی سوداگران کیوں پشتینی تاجر ہیں۔ اس کی

سیدھی سادھی وجہ قدیم پنجاب (وادیٔ پنجند) کا محلِ وقوع، جغرافیائی
حالات اور دریائی گزرگاہیں ہیں جو ابتدائے آفرینش سے تجارت
کے لئے کلیدی درجہ رکھتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقام ہمیشہ سے
سیاحوں اور تاجروں کے لئے باعث کشش رہا ۔

میرے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ قدیم پنجاب سے
ترک مکانی کرنے والے دلی کے پنجابی سوداگران کے آباؤ اجداد نے
اپنے قیام کے لئے دلی کو کیوں منتخب کیا جبکہ شہر آگرہ اس وقت
ملک کا دارالسلطنت تھا ۔

دانشوروں کا بیان ہے کہ اگر سوال منطقی ہو تو جواب کے لئے
منطقی دلائل ہونا چاہئیں ۔ اور علم منطق کی رو سے "تاجر خواہ کسی طبقہ
رنگ و نسل یا مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو ۔ کساد بازاری سے
گھبراتا ہے اور نئی نئی منڈیوں کا متلاشی رہتا ہے اس ضمن میں تاریخ
راہ نمائی کرتی ہے اور یہ بتلاتی ہے کہ شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ
شاہراہیں (خشکی کے راستے) مکمل ہو جانے سے جو چیز سب سے زیادہ
متاثر ہوئی وہ قدیم پنجاب (وادیٔ پنجند) کی تجارت ہے ۔ جس کے روبہ
انحطاط ہوتے ہی وہاں کساد بازاری کا دور شروع ہوا ۔ بعدازاں
جہانگیر کے دورِ حکومت میں بیرون دلی ایک تجارتی بستی بنام
منڈی منصۂ شہود پر آئی اور دلی کے پنجابی سوداگراں کے آبا و اجداد
جو پہلے ہی کساد بازاری کے سبب پریشان تھے اور نئی منڈی کے متلاشی
تھے دلی پہنچ گئے ۔

میرا منشا نہ مدح سرائی ہے نہ ہجو گوئی بلکہ حقائق کو جو تحقیق کی

روشنی میں سامنے آئے ہیں ۔ من و عن بیان کرنا ہے ۔ جب بھی
قوم کے سامنے اس کے افکار و حقائق کی سرگزشت بیان کی جائے تو
ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی کوتاہیوں کا جائزہ اسی طرح لیں جس
طرح ہم اپنی خوبیوں کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔
دراصل تاریخ اظہار محاسن کا نام نہیں بلکہ یہ خود احتسابی ہے ۔ وہی
لوگ اس راہ میں کامیاب ہوتے ہیں جو تاریخ کو اسی کی حیثیت
سے دیکھتے ہیں ۔ اس کی کیفیت پانی اور ہوا کی سی ہوتی ہے کہ
کافر و مومن اور غریب امیر کے لئے اس کی تاثیر نہیں بدلتی
بلکہ اس کا فیضان سب کے لئے برابر ہے ۔

امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی قوم یا برادری بلکہ شخصیت تک
ایسی نہیں جس کی تاریخ صرف عظیم الشان واقعات اور کارناموں سے
مملو ہو اور اس میں کسی قسم کی اخلاقی، فکری یا تمدنی و سماجی
خامیاں اور کمزوریاں نہ ہوں شاید ہی کوئی معاشرہ ایسا ہو جس کی
تاریخ صرف لغزشوں سے پُر ہو اور وہ ہر طرح کی خوبیوں سے تہی دامن
ہو ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم ملت، قبیلہ، برادری، مختلف نشیب
و فراز سے گزرتی ہے اچھے اور بُرے دن سب ہی پر آتے ہیں ۔
حالات کے اسی الٹ پھیر کی طرف قرآن مجید نے تلك الايام ندا
ولها بين الناس (۱۳، ۱۴) میں اشارہ کیا ہے ۔
پس حقیقت پسند وہ ہے جو کائنات کی طرح سچائی سے انکار نہ کرے
الحمد للہ میرا نقطۂ نظر یہی رہا ہے ۔ میں اس دائمی،
عالمگیر اور قدیم سچائی سے انکار نہیں کرسکتا ۔ قرآن حکیم اور اس کی

بیان کردہ تمام حکمتوں پر میرا ایمان ہے بلاشبہ انسان کی ہر سعی میں غلطی اور خامی کا امکان ہوتا ہے ۔ میں بھی اپنی اس حقیر سعی کو اس سے مبرّا نہیں سمجھتا۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے اس کتاب میں اپنے بہترین مطالعے اور تحقیق کو پورے خلوصِ قلب اور دیانتداری سے مرتب کیا ہے ۔

قارئین کرام سے میری استدعا ہے کہ اگر مجھ سے کوئی فروگذاشت ہو گئی ہو یا کوئی خامی رہ گئی ہو تو درگزر فرماتے ہوئے اپنی بیش بہا معلومات اور زرین آراء سے مجھے محروم نہ رکھیں تاکہ آئندہ ایڈیشن اس سے بہتر طریقے پر منظر عام پر آسکے ۔

آخر میں اپنے دوست محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب مرحوم شعبہ اردو فیڈرل گورنمنٹ اردو کالج، جناب اعجاز احمد صاحب سنگھانوی ایم اے تاریخ اسلام اور صاحبزادہ حافظ حقانی میاں قادری مالک پاک اکیڈمی کا شکر گزار ہوں کہ ان حضرات نے اس کتاب کی تدوین و تالیف میں میری مدد فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا اور بعض قابل قدر اور کمیاب کتابیں فراہم کیں۔ میں جناب سرور احمد توقیر صدیقی صاحب کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اس پر نظر ثانی کی اور کتابی شکل میں ترتیب دی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر دے

عطاء الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

(۱) سپتہ سندھو، پنجند یا قدیم پنجاب

تاریخ سندھ بشمول پنجاب کی قدامت سے متعلق تو کوئی واضح ثبوت پیش نہیں کرتی لیکن اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے جب آریہ اس ملک میں آئے تو انھوں نے اس خطے کا نام سپتہ سندھو رکھا جس کے معنی سات دریاؤں یا ندیوں کا ملک ہے، سپتہ ـــــ کے معنی سات اور سندھو کے معنی دریا ہے۔ اس وقت پنجند کے پانچ دریاؤں (۱) جہلم (۲) راوی (۳) بیاس (۴) ستلج (۵) چناب کے علاوہ سندھ اور سرساوتی بھی شامل تھے۔ اسی لئے اسے سپتہ سندھو کہا جاتا تھا۔

سلاطین مغلیہ کے عہد سے پہلے صرف دریائے سندھ کے علاقے کو پنجاب کہتے تھے یہاں پانچ دریا آکر گرتے تھے اس لئے اسے پنجند بھی کہا

جاتا تھا ۔(۱) زمانۂ قدیم میں جو علاقے دریائے سندھ کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے وہ کشمیر سے ٹھٹھہ تک پھیلے ہوئے تھے ۔ اور ان کا نام پنجاب تھا (۲) مختلف ادوار میں صوبہ پنجاب کی حدود میں وقتاً فوقتاً رد و بدل ہوتا رہا ۔ ایک زمانے میں مشرق میں دریائے بیاس اور مغرب میں دریائے سندھ کا درمیانی علاقہ اس میں شامل تھا (

بقول مفتی غلام سرور اس خطے کا نام "پنج دوآب" تھا ۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا لفظ "دو" حذف ہوگیا اور پنج آب رہ گیا (۴) بعض مؤرخوں نے کانگڑاہ کے پہاڑی علاقے کو بھی پنجاب کا علاقہ قرار دیا ہے ۔

خلاصۃ التواریخ میں منشی سبحان رائے بٹالوی نے پنجاب کے دارالسلطنت لاہور کے حدود اربعہ کو یوں بیان کیا ہے "اس صوبے کا طول ستلج سے دریائے سندھ تک ایک سو اسی کوس اور عرض بہرہ سے چوکھنڈی تک ستاسی کوس مشرق میں سرہند مغرب میں ملتان، شمال میں کشمیر اور جنوب میں دیپال پور ہے ۔ بٹالوی نے دارالامان ملتان کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اس کا حدود اربعہ یوں بیان کیا ہے "مشرق میں سرہند مغرب میں کچھ مکران، شمال میں شور کوٹ اور جنوب میں اجمیر"

منوچی پنجاب کو عملداری لاہور کا قائم مقام قرار دے کر رقم طراز ہے کہ بھکر کے نزدیک سات دریا ملتے ہیں ۔ ان میں سے پانچ عملداری لاہور کے علاقے میں نکلتے ہیں اور ان کا منبع سری نگر اور کشمیر کے پہاڑوں میں ہے اسی لئے عملداری لاہور کو پنجاب کہا جاتا ہے ۔

عطا ؑالملک جوینی تاریخ جہاں کشا ہی میں حدود بلخ و ترمذ میں دریائے جیحوں کے کنارے کے مقام کو پنجاب کہتا ہے ۔ منہاج سراج

حاشیہ ۲۳ صفحہ پر دیکھئے

کی طبقات ناصری میں پنجاب سے مراد دریائے سندھ کے معاون دریاؤں کا علاقہ پنجند ہے جب کہ تاریخ فیروز شاہی میں اس کے مختلف علاقے اپنے مرکزی شہر مثلاً جالندھر، لاہور، دیپال پور اور ملتان کے نام سے منسوب تھے۔

ویدک دور میں پنجاب کی سرزمین سپتہ سندھو کہلاتی تھی اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سرزمین سات دریاؤں سے سیراب ہوتی تھی اور وہ سات دریا یہ تھے۔

(۱) دریائے سندھ (۲) دریائے جہلم
(۳) دریائے چناب (۴) دریائے راوی
(۵) دریائے بیاس (۶) دریائے ستلج
(۷) دریائے سرساوتی۔

عہد مغلیہ میں ابوالفضل نے اپنی تالیفات میں پنجاب کا ذکر ایک صوبے کی حیثیت سے کیا ہے اور اس کو پانچ دوآبوں میں منقسم کیا ہے وہ دوآبے یہ ہیں۔

(۱) جالندھر دواب۔ بیاس اور ستلج کے درمیاں
(۲) باری دوآب بیاس اور راوی کے درمیان
(۳) رچنادوآب۔ راوی اور چناب کے درمیان
(۴) چنہت (چج) دوآب۔ چناب اور بہت (جہلم) کے درمیان
(۵) سندھ ساگر دواب۔ جہلم اور سندھ کے درمیان

غرض کہ پنجاب کی حدود مختلف ادوار میں تبدیل ہوتی رہی ہیں کبھی پنجاب کا دارالحکومت لاہور رہا اور کبھی ملتان اور کبھی دہلی۔ کبھی

33. History of India—Ancient Period.

The Relation between Histoiy & Geography—The situation, physical conditions, clim produce and other Geographical data of a country exercise a great influence on its history. The fer plain of North India has ever been a centre of attraction for foreigners Nature has provided for protection of this country by supplying it with the lofty, ice-clad Himalayas in the north and the Indian Ocean in the south. But in the north-west there are the not-so-high Sulaimans with the Khy and many other passes. It was this weak point in India's natural defences, that was exploited Alexander, the Shakas, the Huns, the Ghaznavid, the Ghori, the Moghuls, Nadir Shah, the Abdali other invaders. Most of these "visitors" settled down here, for here they could get plenty to live and that, too, for a minimum of exertion. But this very plenty, coupled with the hot climate, indu sloth and robs one of a good deal of one's hardihood. That is why each fresh batch of invaders, com from cold, dreary highlands where living is so hard, could easily subdue the former settlers ushering its own rule. The plateau of the Deccan remained more secure, because it is guarded by sea mountain ranges, and living here is not so very tempting.

Stone Age—In the old, old pre-historic times, when man had just come into being, he liv unclad in trees and caves, like so many other animals of the wild. He ate roots, fruit and raw flesh, which he killed animals by means of sharp flint pieces. Gradually he learned to till and herd, to ma flint tools and weapons and coarse dwellings or huts. Later he also learnt how to make a fire, by degrees he began to put it to various uses.

Bronze Age—During this period implements, weapons, utensils, ornaments and several ot articles of copper, bronze and other metals and alloys began to be made. Cotton and woollen clo too come into use. Man began to live collectively in villages. Thus began civilization.

The Aboriginal Inhabitants of India—In ancient times this country was inhabited by the *Kol* the *Bhils*, the *Gonds* and the *Santhals*, who still live in the forest-clad hills of Central India. *Dravidians*, found today in the Deccan, may have been the natives of this very part, the South Seve traces of Bronze Age Dravidian civilization have recently been discovered in Sind, in the Mohenjod excavations. Some believe that the Dravidian civilization is more ancient than the Aryan one. *Mongols*, a yellow-skinned people with oblique eyes, inhabit the Himalayas, Eastern Bengal and Burm They may have come from their homeland, Mongolia, in Central Asia, over China and Tibet and ente India by way of the Brahmaputra Valley.

The Aryans—The majority of the present day population of India are members of the Ary race. Historians differ as to the true home of the Aryans and the time of their settling in India. Ma believe them to be the original inhabitants of the Punjab and the surrounding region. But a mo common belief is that thousands of years ago, these people used to herd in the steppes of western As and from there several batches went out to Europe on the one hand and to Iran, Afghanistan and Ind on the other, and settled there. All these countries are, of course, predominantly inhabited by Aryan and their speeches, the Indo-European tongues, too are descended from a common stock, the Ary Parent-Speech.

The ancient Indo-Aryans spoke Sanskrit. The four *Vedas* (*Rig*, *Sâm*, *Yajur* and *Atharva*), th *Brâhmana Granths*, the *Upanishads*, the *Aranyaks* and other *Shrutis*, the *Râmâyana*, the *Mahâbh* the *Manu Smriti* and the *Darshan Shâstras* or Six Schools of Hindu Philosophy (*Pûrva Mîmânsa*, *Utt Mîmânsâ*, *Yog*, *Vaishéshik*, *Sânkhya and Nyâya*) are among their sacred books. They believed in th Oneness of God. They worshipped as gods the various forces and phenomena of Nature, for th exercise a great influence on our existence. *Indra* was their Rain-god, *Agni* the Fire-god, *Vayu* th Air-god, *Sûrya* the Sun-god, *Indu* or *Chandramá* the Moon-god, *Varuna* the Water-god and so on. Th ancient Aryans could spin and weave, make garments, cultivate, manufacture implements and weap turn out utensils and ornaments and erect buildings Their habitations were usually located along riv banks Each member of a family considered it his or her duty to obey the head of the family. Th ruler considered it sacred to protect his subjects and to maintain peace and order in his territ Women participated in the performance of *Yajnas* and other religious rites side by side with m *Swayamvar*, or self-selection of one's husband, was commonly practised. The whole nation was divid into four *varnas* or classes, the *Brahmanas*, the *Kshatriyas*, the *Vaishyas* and the *Shûdras*. This classifi cation was, as a matter of fact, occupational. That is to say, they were the Learned Class, the Marti Class the Peasant Class and the Menial Class. The life of man was supposed to last a hundred yea and it was divided into four stages or *Ashramas*—*Brahmacharya* (celibate student life), *Grihastha* (family life), *Vânaprastha* (forest-dwelling) and *Sanyas* (complete renunciation of worldly life).

Ancient Aryan Settlements—*Saptasindhu* was the land of the Gomati (Gomal), the Krumu (Kurram), the Kabha (Kabul), the Sindhu (Indus), the Krishna Ganga, the Vitashta (Jhelum) and th Chandra-Bhâgâ (Chenâb) rivers, Pancha-nad was the name for the Punjab. *Brahmavartta* was the holy land between the Saraswati and the Dirshadwati (Ghaggar). *Brahmarshi Desh* lay on either side of the northern part of the Ganges; it included the kingdoms of Kuru and Pánchâl. *Madhya Desh* wa the central land from the Himâlayas to the Vindhyas and from Prâg (Allahabad) to the mouth of th Saraswati (Sind). The whole country from Bengal to the Indus was called *Aryavartta*

پنجاب جس کا نام کبھی پنج ند تھا ———— بشکریہ اعجاز الرحمٰن (کھلونے والے)

ملتان اور لاہور دو صوبے ہو گئے اور دارالسلطنت دہلی قرار پایا۔ کبھی ٹھٹھہ سے کشمیر تک کا علاقہ پنجاب کے نام سے موسوم ہوا اور کبھی صرف پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کہلائی اور کبھی سات دریاؤں سے سیراب ہونے والا علاقہ پنجاب کہلایا۔ پس یہ حقیقت اٹل ہے کہ پانچ دریاؤں کی سرزمین (پنجند) کہلاتی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ حکمرانوں نے اپنی سلطنت کی عمل داری کے اعتبار سے مختلف علاقوں کو پنجاب قرار دیا۔

پنجاب کا علاقہ اپنی سرسبزی اور اعلیٰ پیداوار کے سبب سے ہر دور میں کشش کا باعث رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اس علاقے پر ہر دور میں قبضہ کرنے کی کوششیں جاری رہیں۔ یہی وہ علاقہ ہے جو آریاؤں کے لئے باعث کشش بنا اور وہ اس علاقے کی سرسبزی و شادابی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اس علاقے کو اپنا مسکن بنا لیا اور یہیں بودوباش اختیار کرلی۔ اور یہاں کے قدیم باشندوں کو مار کر آگے جنوبی ہند کی طرف دھکیل دیا۔

حاشیہ صفحہ:- (۱) تاریخ قدیم ہندوستان صفحہ ۶۷، عنوان:- ہندوستان میں قدیم آریائی نوآبادیات از بابا سنگھ ایم اے، پی ایچ ڈی
ناشر:- مسند دولت رائے، ایم اے بھارتی پریس لاہور

(۲) تاریخ سندھ المعروف تاریخ معصومی از میر محمد معصوم بھکری
ترجمہ از اختر رضوی - سندھی ادبی بورڈ

(۳) تذکرہ علمائے پنجاب صفحہ ۲۷ از اختر راہی ناشر مکتبہ رحمانیہ لاہور

(۴) ایضاً

یہی وہ خطہ ہے جو سکندر اعظم کے لئے باعث کشش ثابت ہوا اور اس نے اسے فتح کر کے ایک یونانی جرنیل کے حوالے کر دیا تھا۔ کئی ایک نئے شہر آباد کئے گئے جہاں بہت سے یونانی باشندے بھی آباد ہو گئے یہی سبب ہے کہ پنجاب کے تمدن اور اس کی تہذیب پر یونان کا اثر پڑا۔

اس حملے کا سب سے پہلا اور اہم اثر یہ ہوا کہ برصغیر میں تاریخ کے بارے میں مستند قسم کی روایات قلم بند کرنے کا رواج ہوا جب کہ اس سے پہلے تاریخ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ سکندر کے ساتھ بہت سے سائنس دان، ادیب اور مورخ بھی آئے تھے۔ ان لوگوں نے نہایت دیانتداری سے اس دور کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ دوسرے اس طرح مشرق و مغرب کے راستے ایک دوسرے پر کھل گئے۔

بہت سے یونانی پنجاب میں آباد ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے پنجابی ثقافت بے حد متاثر ہوئی۔ سکندر کے حملے کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ سکوں کے ڈھالنے کا فن ترقی کر گیا۔ پنجاب میں سکے نہایت بھدے اور وزنی تیار کئے جاتے تھے۔ یونانیوں کی آمد کے بعد ان میں نفاست آگئی۔ یہی سنگ تراشی کا عالم تھا۔ پنجاب کے لوگ اس فن میں ماہر نہیں تھے۔ اس میں حسن بھی یونانی راہ و رسم کے بعد ہی پیدا ہوا۔ ہندی یونانی فن کے حسین امتزاج نے گندھارا آرٹ کو جنم دیا۔ سکندر کے حملے کا سیاسی اثر یہ ہوا کہ یہاں قبیلوں کا سرداری نظام ختم ہو کر رہ گیا جس کے نتیجے میں ایک وسیع اور مضبوط حکومت کی داغ بیل پڑی۔

چندر گپت موریا کے عہد حکومت میں پنجاب کی سرحدیں بلوچستان اور افغانستان تک پہنچ گئیں تھیں اس دور میں پنجاب کا صوبہ بڑا خوشحال

تھا یہاں کے لوگ سونے اور چاندی کے زیورات پہنتے تھے جلوسوں اور تہواروں میں حصہ لیتے۔ اچھا لباس پہنتے تھے۔ چوری کا کسی کو ڈر نہیں تھا۔ لوگ مکانوں کو تالا تک نہیں لگاتے تھے۔ لوگوں کی غذا سادہ تھی لوگ اکثر گھوڑے اور ہاتھی سواری کے لیئے استعمال کرتے تھے۔ تجارت کی ترقی کی وجہ سے ملک خوشحال تھا۔ تجارتی ترقی کے لیئے مواصلات اور ذرائع آمد رفت میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ ایک سرکاری سڑک تعمیر کروائی گئی جو ملک کے اندرونی حصے کو صوبہ سرحد اور ٹیکسلا سے ملاتی تھی۔ ان سڑکوں پر میلوں کے لیئے پتھر استعمال کئے گئے تھے۔ تجارت کے علاوہ فوجی نقل وحرکت کے لیئے بھی یہ سڑکیں استعمال ہوتی تھیں پنجاب کے لوگوں کو بیرونی حملوں نے چاق وچوبند رہنا سکھادیا تھا۔ وہ لڑائی کے شوقین تو نہ تھے لیکن بیرونی حملہ آوروں نے انھیں اپنی حفاظت کرنا سکھادیا تھا۔

مسلمانوں کی برصغیر پاک وہند میں آمد کے وقت ملتان کا صوبہ سب سے وسیع تھا جو ملتان سے لے کر کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں لاہور ڈویژن کے علاوہ مشرقی پنجاب کے اضلاع امرتسر، گورداسپور اور فیروزپور شامل تھے۔

محمد بن قاسم ثقفی کی کمان میں اسلامی لشکر جب ملتان پہنچا تو حاکم ملتان کے سخت مقابلہ کے باوجود فتح یاب ہوا۔ یہ ۷۱۳ء میں ہوا۔ ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے پنجاب کے کچھ اور حصے بھی فتح کئے۔ اور سندھ وپنجاب میں اسلامی بنیادوں پر سلطنت کو استوار کیا اور لوگوں کو مذہبی آزادی دی۔ محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد نہ صرف پیش

قدمی رک گئی بلکہ سندھ اور ملتان مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ یہ فتوحات کا سلسلہ پھر ترکوں کے ہاتھوں شروع ہوا۔ ترک آگے بڑھے اور انھوں نے اسلامی سلطنت کے قیام اور تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعض مؤرخین کے نزدیک اسلامی ریاست کے قیام اور تبلیغی خدمات میں ترکوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ترک جسمانی ذہنی، جنگی سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

۹۷۷ء میں راجہ بھیم پال کی حکومت میں ملتان، سیالکوٹ اور دوآبہ بست جالندھر تک کا علاقہ شامل تھا۔ ۹۷۸ء ہی راجہ بھیم پال کے بیٹے جے پال نے توسیع پسندانہ ارادوں کے ساتھ مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی لیکن سبکتگین نے اس کو شکست دی اور جے پال نے جلال آباد کے بجائے لاہور کو اپنی راجدھانی بنالیا۔

۱۰۰۵ء میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور، کشمیر اور ملتان فتح کر کے پنجاب کی حکومت نواسہ شاہ کے سپرد کر کے ۱۰۰۶ء میں غزنی مراجعت کی نواسہ شاہ راجہ جے پال والی لاہور کا نواسہ تھا اور اس کا ہندوانی نام سکھپال یا سکھ پال تھا اس نے اسلام قبول کرلیا تھا اور مسلمان اس کو نواسہ شاہ کے نام سے موسوم کرتے تھے سلطان محمود غزنوی کو اس پر اعتماد تھا لیکن محمود غزنوی کے غزنی پہنچتے ہی نواسہ شاہ مرتد ہو گیا اور بغاوت کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا سلطان محمود نے ترک نوجوانوں پر مشتمل ایک گھڑسوار دستہ نواسہ شاہ کی بغاوت کو کچلنے کے لیئے روانہ کیا اس دستے نے بغاوت کو کچل کر نواسہ شاہ کو گرفتار کرلیا اور

سلطان محمود کے روبرو پیش کیا۔ سلطان نے اسکو تاحیات قید کا حکم دیا اور قید ہی میں وہ مرگیا۔

سلطان محمود غزنوی کو پنجاب پر پورا قبضہ کرنے کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کئی بار ہو چکا تھا اس لئے اس نے پنجاب کا مکمل فتح کا منصوبہ بنالیا۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ فوج کے علاوہ ادیب، شاعر، انجینئر، سنگ تراش، لوہار اور بڑھئی بھی لے کر آیا تھا۔ اس دفعہ اس کے سامنے پنجاب کی تنظیم نو اور غزنی سے اس کا الحاق بھی تھا۔ اس نے لاہور کو دارالسلطنت بنایا اور افسروں کی نگرانی میں دیا۔ اہم مقامات پر چھاؤنیاں قائم کیں اس طرح پنجاب مکمل طور پر اس کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ ۱۱۸۴ء میں خسرو ملک بن خسرو شاہ پنجاب کا حاکم تھا۔ ۱۱۸۶ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے لاہور پر حملہ کیا۔ اس نے لاہور کو مکمل طور پر فتح کرکے اس پر غوریوں کی حکومت قائم کرلی۔

سلطان محمود غوری کی وفات کے بعد ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو قطب الدین ایبک لاہور کی طرف روانہ ہوا اور جون ۱۲۰۶ء کو لاہور پہنچا جہاں شہریوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ دوسرے ہی دن اس کی تاج پوشی ہوئی۔ اُمراء اور عوام نے اسے بادشاہ تسلیم کرلیا اس طرح قطب الدین ایبک کو برصغیر کا پہلا مسلمان فرماں روا ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ایبک صرف چار سال حکومت کرنے کے بعد ۴ نومبر ۱۲۱۰ء کو لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور فوت ہوا اور لاہور ہی میں دفن ہوا۔

منگولوں کے حملوں کی وجہ سے پیدا شدہ صورت حال کا مقابلہ

کرنے کے لئے بلبن نے شہزادہ سلطان کو لاہور اور ملتان کا گورنر مقرر کیا یہ شہزادہ بے پناہ فوجی اور انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے اپنے فرائض کو حسن و خوبی انجام دیا۔ یہ شہزادہ علماء و فضلاء کا بڑا سرپرست بھی تھا۔ جب یہ دہلی سے ملتان آیا تو تمام بڑے بڑے فضلاء کو ساتھ لے آیا ان میں مشہور صوفی شاعر امیر خسرو دہلوی بھی شامل تھے۔ ملتان آکر شہزادے سلطان محمد نے دفاعی انتظامات کو مؤثر بنایا۔ منگول حملہ آور اوّل تو ادھر کا رُخ ہی نہیں کرتے اور اگر آ بھی جاتے تو سخت نقصان اُٹھا کر واپس جاتے۔ اس کے انتظامات کی وجہ سے پنجاب میں امن قائم ہوگیا۔ اور یہاں کے باشندوں نے سکھ کا سانس لیا۔

۱۲۱۲ء میں پنجاب پھر ترکستان کا نشانہ بنا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے منگولوں کو شکست دی اور وہ فرار ہوگئے مگر ان کا ایک سردار الغوخاں جو چنگیز خاں کی اولاد ہی تھا۔ اپنے تین ہزار ساتھیوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ سلطان نے دہلی کے قریب ان کو آباد کیا اور ان کی پوری دیکھ بھال کی۔

۳ اکتوبر ۱۲۹۶ء کو علاء الدین خلجی دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد کا ابتدائی حصہ منگول حملوں کی وجہ سے مشہور رہے۔ منگول بار بار حملہ آور ہوئے۔ لاہور، ملتان اور سندھ کا علاقہ تاتاریوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس لئے سلطان کو ساری قوت اس فتنے کو کچلنے کے لئے صرف کرنا پڑی۔

۱۲۹۷ء میں امیر داؤد کی قیادت میں ایک لاکھ تاتاریوں کا لشکر پنجاب اور سندھ کی فتح کے ارادے سے آیا۔ سلطان نے اپنے بھائی

الپ خان کو ان کے مقابلے کو بھیجا ۔ لاہور کے قریب دونوں فوجوں کا سامنا ہوا ۔ ہلاکت خیز لڑائی کے بعد منگول بارہ ہزار لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے جن میں ان کے اعلیٰ افسر بھی شامل تھے ۔

۱۲۹۸ء میں دو لاکھ تاتاری ٹڈی دل لشکر کے ساتھ قتلغ خاں کی سرکردگی میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے لاہور میں داخل ہوئے لیکن خون ریز معرکے کے بعد تاتاری بھاگنے پر مجبور ہو گئے ۔ سلطان علاءالدین نے تقریباً بیس سال حکومت کی اور پنجاب اور سندھ کا علاقہ اس کے زیر سلطنت رہا ۔

۱۲۹۸ء ہی میں امیر تیمور حملہ آور ہوا اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا وہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا لیکن وہ تباہی اور بربادی کے ایسے نشانات چھوڑ گیا جو عبرت ناک تھے جو تباہی اس حملہ کی وجہ سے آئی اس کی مثال تاریخ نہیں ملتی ۔

۱۴۵۱ء میں بہلول خان لودھی دہلی کے تخت پر بیٹھا اور پنجاب آکر ملتان میں انتظامیہ اور فوج کو نئے سرے سے منظم کیا لیکن تاج دہلی کے نمائندے دولت خان لودھی چال بازیوں اور غداری کے نتیجے میں بابر حملہ آور ہوا اور دہلی کی کی فوج کو شکست دیکر فاتحانہ لاہور میں داخل ہوا اور اپنے لوگوں کو مختلف علاقے سپرد کرکے کابل واپس چلا گیا دوبارہ برصغیر فتح کرنیکے ارادے سے بابر لاہور آیا اور پنجاب میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے بعد دہلی کے حکمران ابراہیم لودھی سے پانی پت کے میدان میں نبرد آزما ہوا اور فتح حاصل کی ۔

پانی پت کی جنگ میں فتح حاصل ہونے کے بعد فوراً بابر نے مرزا محمد سلطان کو دہلی پر اور شہزادے ہمایوں کو آگرہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ

کیا ۔ ۲۳ اپریل کو بابر دہلی میں داخل ہوا جہاں اس نے سب سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر حاضری دی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا ۔ دہلی سے بابر آگرہ گیا ۔ شہزادہ ہمایوں نے شاندار استقبال کیا اور شاہی خزانہ جس میں کوہ نور ہیرہ شامل تھا پیش کیا ۔ چار سال تخت دہلی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد بابر آگرہ میں فوت ہوا ۔

بابر کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا ۔ اس کو آغاز میں ہی کئی طرح کی مشکلات سے پالا پڑا مرزا کامران نے ہمایوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پنجاب پر قبضہ کر لیا ۔ چوسہ کی لڑائی میں شکست کھا کر ہمایوں نے راہ فرار اختیار کی ۔ پندرہ سالہ جلاوطنی کے بعد ہمایوں تخت دہلی پر دوبارہ جلوہ افروز ہوا ۔ اس نے پشاور ، لاہور ، کلانور ، دیپالپور ، ہریانہ اور جالندھر کو فتح کیا اور اس طرح پنجاب کے تمام علاقے پر اس کا قبضہ ہو گیا ۔

شیر شاہ سوری نے اپنے معتمد ترین جنرل خواص خاں کو لاہور کا حاکم مقرر کیا ۔ جس نے مرزا کامران کو کابل کی طرف بھگا دیا ۔ پاک پٹن ، ملتان وغیرہ کو فتح کرکے ان علاقوں میں انتظامی اصلاحات کے لئے احکامات جاری کئے ۔ پنجاب کی فتح کے بعد شیر شاہ نے اپنی سلطنت کی حدود و سندھ تک وسیع کر لیں ۔

ہمایوں کے بعد جب اکبر بادشاہ بنا تو اس نے ۱۵۷۵ء میں خان جہاں کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا ۔ جو ۱۵۷۹ء تک اس عہدے پر فائز رہا پھر راجہ مان سنگھ کو یہ منصب عطا کیا گیا ۔

شاہ جہاں بھی ۱۶۳۳ء میں پہلی مرتبہ لاہور آیا ۔ یہاں کے انتظامات کا ملاحظہ کیا اور ان کو مزید بہتر بنانے کا حکم دیا لاہور سے بادشاہ انبالہ

گیا اور پھر لاہور آیا قلعہ لاہور میں اکبر اور جہانگیر کے عہد کی بہت سی عمارتیں جو پرانی اور بد وضع ہو چکی تھیں گرا کر جدید عمارتیں بنانے کی ہدایت کی۔ آصف خان کے نو تعمیر شدہ محل کا معائنہ بھی کیا۔

اورنگ زیب بھی تخت سلطنت پر فائز ہونے کے بعد ۱۶۶۲ء کے آخر میں دہلی سے پنجاب روانہ ہوا شالیمار باغ میں آکر ٹھہرا اور ایک ہفتہ وہاں قیام کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوا اور قلعہ میں نزول اجلال فرمایا اور قریب اڑھائی مہینے قیام کرنے کے بعد کشمیر کی سیاحت کے لئے روانہ ہوا۔

فروری سنہ ۱۷۰۰ء میں شہزادہ محمد معظم کو ایک بار پنجاب میں بادشاہ کا نائب مقرر کیا گیا یہی شہزادہ اورنگ زیب کے بعد بادشاہ بھی بنا تھا۔

۲۷ ستمبر سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ پنجاب میں داخل ہوا اور اس نے بڑی تباہی مچائی۔ اس وقت کے گورنر زکریا خان نے تحفے تحائف زرنقد ہاتھی اور گھوڑے دے کر نادر شاہ سے معاہدہ کیا اور پنجاب کو مکمل تباہی اور بربادی سے بچایا۔ پھر احمد شاہ بادشاہ کا دور آیا اس وقت معین الدین میر منو پنجاب کا گورنر تھا اور کوڑا مل ملتان کا نائب گورنر تھا۔ اس دور میں امن و امان تھا۔

سنہ ۱۷۳۰ء میں بڑے بڑے سکھ سرداروں نے جا بجا اپنی خود مختار ریاستیں، قائم کرلیں۔ یہ ریاستیں، مسل، کہلاتی تھیں پنجاب میں اس قسم کی بارہ "مسلیں" تھیں۔ یہ سکھ سردار اکثر آپس ہی میں لڑتے تھے لیکن بیرونی خطرے کا مقابلہ وہ متحدہ طور پر کرتے تھے ان مسلوں میں سب سے بڑی "بھنگی مسل" تھی جس نے لاہور فتح کیا۔

ویدی اور بدھ دور کے ہندوستان کا نقشہ

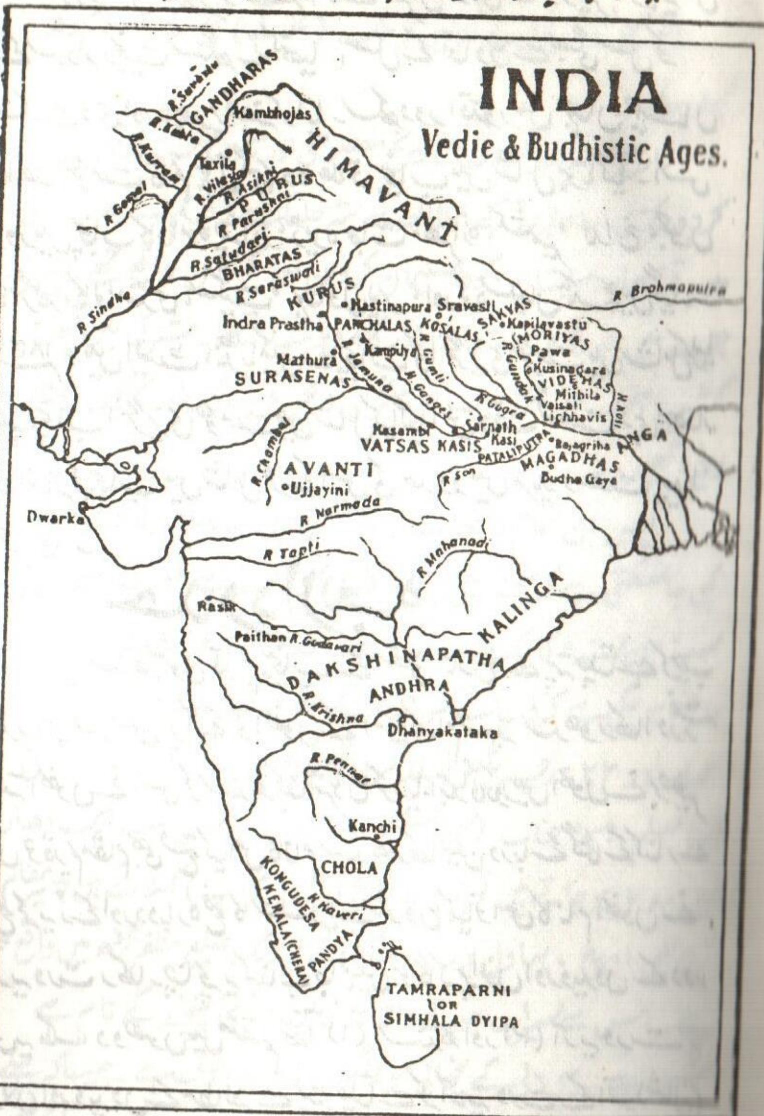

نقشہ ۱۔ سپتہ سندھو (بشمول پنج ند) دریائے سرساوتی جو اب معدوم ہو گیا ہے صاف دیکھا جا سکتا ہے

بشکریہ! اعجاز الرحمٰن (کھلونے والے)

اور یہ مسل لاہور پر ۱۷۹۹ء تک حکمراں رہی ۔ اور پھر سکر چکیہ مسل کے سردار رنجیت سنگھ نے کنھیا مسل کے تعاون سے بھنگی مسل کو شکست دی اور لاہور پر قبضہ کر لیا ۔ سکھ دور اقتدار میں جہاں جہاں خالصہ حکومت قائم ہوتی گئی وہ علاقہ پنجاب میں شامل ہوتا گیا ۔ اس دور میں پنجاب کا دائرہ پشاور، ڈیرہ جات، ہزارہ، کشمیر، لداخ، جموں کانگڑھ، کانو، منڈی، سکیت، بہاول پور، اور کوہ سلیمان تک پھیل گیا۔

۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پنجاب کو انگریزی حکومت میں شامل کر لیا جب پنجاب انگریزی حکومت میں شامل کیا گیا اس وقت قسمتِ دہلی، حصار اور انبالہ کو پنجاب میں شامل کر کے اس کی حدود میں مزید وسعت پیدا کر دی ۔

(۲) حدود اربعہ

قدیم سندھ بشمول قدیم پنجاب کے متعلق تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب آریہ اس سرزمین پر آئے تو انھوں نے اس کا نام سپتہ سندھو رکھا اور رفتہ رفتہ انھوں نے اس کو سندھ کہنا شروع کر دیا۔ ابتدائی دور میں انھوں نے برصغیر میں جو قدیم مقام بھی فتح کیا اس کا نام سندھ رکھا لیکن دریائے گنگا کے کنارے پہنچ کر یہ رُکے اور دوبارہ فتح کا سلسلہ جب شروع کیا تو اس کا نام انھوں نے آریہ ورت رکھا۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ پرانوں اور ویدوں کے دور میں یہ ملک دو حصوں میں منقسم تھا (۱) سندھ اور (۲) آریہ ورت ۔

پرانوں اور ویدوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آریہ ورت کے اتر (شمال) میں ہمالیہ پربت (سلسلہ کوہ ہمالیہ) دکن (جنوب) میں وندھیاچل (کوہ وندیا چل) پچھم (مغرب) میں دریائے سرساوتی بواب (مشرق) میں دریائے برتپرہ

افغانوں کی نسلی تاریخ بحوالہ ستیارتھ پرکاش مترجم سوامی دیانند

واقع تھے (۱) آریوں نے اولیں جو ملک (علاقے) فتح کئے وہ سندھ کہلائے ۔

تاریخ سندھ المعروف تاریخ معصومی اور تاریخ سندھ حصہ اول شائع کردہ مرکزی اردو بورڈ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم سندھ کے شمال میں قندھار وسیستان، کوہ سلیمان کروان اور کیکان واقع تھے ۔ جب کہ جنوب میں بندرگاہ سورت اور بندرگاہ دیوبندر تھے ۔ مشرق میں قنوج کشمیر، مغرب میں مکران ساحل مکران و بحرِ عرب کی بندرگاہیں دیبل وغیرہ تھیں ۔

پس ان تمام واقعات کی روشنی میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پنجند ہی زمانۂ قدیم کا پنجاب ہے اور وہ قرنہا قرن سرزمین سندھ کا ایک حصہ رہا ہے ۔ قدیم نقشہ جات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر ۹۱ درجہ طول البلد اور ۲۲ درجہ عرض البلد پر واقع پانچ دریاؤں یعنی (۱) راوی (۲) جہلم (۳) چناب (۴) ستلج اور (۵) بیاس جب ایک دھار میں تبدیل ہو جاتے ہیں تو پنجند یا پانچ آب (پنجاب) کہلاتے ہیں یہ مقام آج بھی اوچ، بہاول پور اور ملتان کے نزدیک ضلع مظفر گڑھ میں واقع ہے۔ اس سے سیراب ہونے والا خطۂ زمین وادئ پنجند کے نام سے مشہور ہے ۔ یہی دلی کے پنجابی سوداگراں کا وطن مالوف ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مختلف ادوار میں اس کے حدود اربعہ میں کمی بیشی ہوتی گئی اور پنجاب کے نام سے موسوم ہوتی رہی اور اس خطے میں رہنے والے پنجابی کہلاتے رہے ۔

(۳) برصغیر کے تجارتی حالات

تاریخ شاہد ہے کہ سولہویں صدی کی ابتدائی چوتھائی تک برصغیر پاک وہند میں تجارت بجائے خشکی کے راستوں کے دریائی گزرگاہوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ جس کی سیدھی سادھی وجہ یہ تھی کہ خشکی کے راستے دشوار گزار ہونے کے ساتھ پرخطر اور غیر محفوظ تھے۔ آبادیوں کے درمیان وسیع اور خطرناک جنگلات حائل تھے۔ جن میں راہزن قزاق اور لٹیرے ہر وقت گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ اگرچہ ان سرکش لوگوں سے محفوظ رہنے کے لیے بڑے بڑے قافلے ترتیب دیئے جاتے تھے مگر پھر بھی ان میں تاب مقاومت پیدا نہ ہوتی تھی اکثر ان کا مال لوٹ لیا جاتا تھا اور ان کے ملازمین کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ایسے قافلوں میں بھی شریک ہو کر سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔

وادئ پنجند یا قدیم پنجاب کی تجارت

خشکی کے راستے جتنے پرخطر تھے دریائی گذرگاہوں پر نقل و حمل اور آمد و رفت کی اتنی ہی سہولتیں میسر تھیں اور وادئ پنجند قدیم پنجاب کے پانچ دریاؤں کے مقام اتصال پر واقع ہونے کی وجہ سے دریائی گذرگاہوں میں ایک کلیدی درجہ رکھتا تھا کیوں کہ یہاں سے ایک دریا آمدہ مال اور مسافر دوسرے دریائی سفر کے ذریعے مختلف مقامات پر لانا اور لے جانا بہت آسان تھا۔ اس لیے یہ مقام اپنے قدرتی وسائل اور جغرافیائی محل وقوع کے سبب ہمیشہ تاجروں، صنعت کاروں اور سیاحوں کے علاوہ

حملہ آوروں کے لیے بھی باعث کشش رہا اور یوں اس مقام کو بین الصوبائی بندرگاہ کا درجہ حاصل ہوا۔ چنانچہ قدرت کی پیش بہا سہولت کے سبب جو تاجروں کے لیے سازگار تھی اہل علاقہ کا تجارت پیشہ ہونا یا تجارت کا پیشہ اپنانا ایک فطری امر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے تجارت پیشہ لوگ جدی اور پشتینی تاجر تھے۔

(۴) قدیم پنجاب کا تجارتی انحطاط

شیر شاہ سوری برصغیر میں ایک عظیم بادشاہ تھا۔ اس روشن دماغ حکمران نے چند سالوں میں وہ عظیم کارنامے انجام دیئے جنھوں نے مغلیہ دور کے جاگیردارانہ نظام کی کایا پلٹ دی۔ شیر شاہ کو ہندوستان کی سلطنت نہ تو میراث پدری کے طور پر ملی تھی اور نہ ہی اس نے محلاتی سازش کے ذریعہ تخت و تاج پر قبضہ کیا تھا بلکہ اس دور کے حصول سلطنت کے تمام مروجہ طریقوں میں سے ایک طریقہ پسند کیا اور "ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند" کے مصداق تیغ زنی اور صف شکنی کے جوہر دکھا کر اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس لئے اسے نہ تو امیروں کے کسی گروہ کی نیازمندی کی ضرورت پیش آئی اور نہ اپنے خلاف کسی سازش کا اندیشہ رہا۔ ایسی صورت میں اس کی مطلق العنانی ایک بدیہی امر تھا لیکن اس نے اپنی مطلق العنانی کو رفاہ عام اور فائدہ انام کے لئے بروئے کار لا کر ملک میں ایسا نظام قائم کیا جس نے قرنہا قرن سے دریائی راستوں سے جانے والی تجارت کو خشکی کے راستوں پر لا ڈالا۔ مواصلات، رسل و رسائل کے سلسلے میں اس نے رعایا کی سہولت اور فوجی نقل و حرکت میں آسانی کی غرض سے

بڑی بڑی سڑکیں تعمیر کرائیں جن میں پندرہ سو میل لمبی سڑک بھی شامل تھی یہ سڑک پشاور سے براہ دہلی کلکتہ سونار گاؤں تک پھیلی ہوئی تھی گرانڈ ٹرنک روڈ، جرنیلی سڑک یا شاہراہ اعظم کے ناموں سے معروف تھی۔

وادئ پنجند یا قدیم پنجاب کے پنجابی سوداگران یا تجار پیشہ لوہانے

قدیم لوہانو، لاکھ اور سمہ لوہانہ ان دنوں سندھ کا ایک پرگنہ تھا جس کا حاکم رائے خاندان کے زوال کے وقت اگھم تھا۔ فتحنامہ میں لوہانہ کے حاکم اگھم اور لوہانہ کے جتون کا ذکر آیا ہے۔ لوہانہ کے صوبہ میں لکھو، سمہ اور سہتہ کی اراضی شامل تھی اس اراضی کے یہ نام ان میں رہنے والی قوموں کے نام پر تھے۔ پرگنہ لوہانہ غالباً ضلع سانگھڑ کی شہداد پور اور سنجھورو تحصیلوں اور حیدرآباد ضلع کی ہالہ تحصیل پر مشتمل تھا۔ اس علاقے میں ساہتی، لاکھاٹ کے بعد لوہانو کے نام آج تک ان قوموں کی قدیم بستیوں کی یادگار ہیں۔ شہداد پور کے نشیب میں دریا کی ایک پرانی شاخ اس وقت تک "دریائے لوہانو" کہلاتی ہے۔ کیوں کہ یہ شاخ لوہانہ پرگنہ کے خاص علاقوں سے گزرتی تھی۔ [1]

قدیم پنجاب میں یوں تو مختلف اقوام کے لوگ آباد تھے مگر قوم لوہانہ کے تاجروں کی حیثیت اپنی جگہ منفرد تھی۔ ان میں تاجر بھی تھے کسان بھی لوہار بھی تھے اور یہ سب ہی اپنے وطن مالوف کی نسبت سے پنجابی تھے اس علاقہ میں آباد ہر کسان پنجابی کسان اور سوداگر پنجابی سوداگر تھا۔

۱؎ فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ مترجمہ اختر رضوی صہ ۳۹۱

اور پنجاب سے باہر ملک کے دوسرے علاقوں میں سب پنجابی کے نام سے موسوم تھے۔ غرض کہ ان کے وطن کا نام اور ان لوگوں کی نیک نامی اعلیٰ کارکردگی، حسن اخلاق اور خوش معاملگی کا ضامن رہا۔ یہ لوگ پنجابی کے نام سے ہر جگہ نمایاں اور ممتاز رہے کیوں کہ قوم لوہانہ وادئ پنجند یا قدیم پنجاب کی ایک قدیم ترین قوم ہے اس لئے اس قوم کے سوداگروں کو جدی اور پشتی سوداگر ہونے کا شرف ہمیشہ حاصل رہا ہے اور ان ہی کی نسبت سے دلی کے پنجابی سوداگران کو جدی و پشتی ہونے کا فخر حاصل ہے۔

(۶) دلی کے پنجابی سوداگران کے اجداد کا قبول اسلام

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک کی تعمیر و ترقی اور اسلام کی ترویج و اشاعت میں اولیائے کرامؒ اور صوفیائے عظامؒ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اگر اولیائے کرام اور صوفیائے عظام مبلغین اسلام کے روپ میں اس بُت کدہ ہند میں تشریف نہ لاتے تو یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ اولیائے کرام کی آمد کا مقصد تبلیغ اسلام تھا جو انھوں نے بالطریق احسن انجام دیا۔

تیرہویں صدی عیسوی کے مبلغین میں پیر کبیر الدین حسنؒ تھے جن کے متعلق بہت سی روایات زبان زد عوام ہیں ہو سکتا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں میں سے کسی نے جوش عقیدت میں حد سے تجاوز کر کے مبالغہ آرائی کی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک صاحب کرامت بزرگ تھے۔

دلی کے پنجابی سوداگران میں ان کے ہاتھ پر قبول اسلام کی روایت سینہ

یہ سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے جو ان کے ملفوظات موسوم بہ ملفوظات کمالیہ (قلمی) میں موجود ہے یہ کتاب کتب خانہ سیت پور ضلع مظفر گڑھ میں موجود ہے اور فارسی زبان میں تحریر کی گئی ہے۔

سندھ (بشمول پنجند المعروف بہ پنجاب و ملتان) کی لوہانہ قوم کے ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت گنگا یاترا کے لئے سندھ سے روانہ ہوئی جب یہ لوگ اوچ شریف پہنچے تو پیر کبیر الدین حسن ان کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تم اتنی دور کیوں جاتے ہو تمھیں یہیں گنگا اور جمنا کے درشن کرائے دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تمھیں بت پرستی چھوڑ کر اسلام قبول کرنا ہوگا۔ انھوں نے یہ بات تسلیم کر لی۔ تب پیر صاحب نے کہا کہ تم گنگا اور جمنا کی علامتیں متعین کر لو کہ کن مقامات کی یاترا مقصود ہے۔

دوسرے روز صبح کے وقت ان یاتریوں نے دیکھا کہ جمنا دریا ان کے نزدیک بہہ رہی تھیں اور ان میں وہ سب علامتیں موجود تھیں۔ چنانچہ یاتریوں نے ان کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ اس واقعے کی وجہ سے پیر کبیر الدین کو "حسن دریا" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

(۷) تذکرہ پیر کبیر الدین حسنؒ

نام ونسب: آپ کا نام سید کبیر الدین تھا۔ آپ کے والد کا نام پیر صدر الدین تھا۔ خاندان سادات میں سے تھے آپکا سلسلہ نسب یہ ہے۔

"سید کبیر الدین حسنؒ بن سید صدر الدین بن محمود بن سید شہاب الدین بن سید نصیر الدین سید شمس الدین سید صلاح الدین

صالح بن سید اسلام الدین بن سید عبدالمومن بن سید خالد بن سید مجیب الدین بن سید محمود بن محمد ہاشم بن سید احمد ہادی بن سید جمال مستنصر بن سید عبدالمجید بن سید غالب بن سید منصور بن سید اسماعیل بن سید نور الدین بن سید اسماعیل بن حضرت امام جعفر صادق

لقب ۶۔ سید کبیر الدین حسن "حسن دریا" کے لقب سے بھی مشہور تھے اس لقب سے شہرت کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ سندھ کے ہندوؤں کا ایک قافلہ جاترا کے لئے روانہ ہوا۔ جب یہ قافلہ اُوچ پہنچا تو ان کی ملاقات سید کبیر الدین حسنؒ سے ہوئی۔ سید کبیر الدین حسن کو جب معلوم ہوا یہ لوگ جاترا کے لئے جا رہے تھے تو آپ نے فرمایا تم اتنی دور کیوں جا رہے ہو میں تمھیں گنگا اور جمنا کے درشن یہیں کرائے دیتا ہوں بشرطیکہ تم اسلام قبول کر لو۔ انھوں نے آپ کی یہ بات منظور کر لی پھر آپ نے ان سے فرمایا کہ اچھا اب تم گنگا اور جمنا کی علامتیں متعین کر لو پھر دیکھو کہ تمھیں یہ علامتیں نظر آتی ہیں یا نہیں۔ چنانچہ انھوں نے علامتیں متعین کر لیں دوسرے دن صبح کے وقت ان جاتریوں نے دیکھا کہ گنگا اور جمنا دونوں ان کے قریب سے بہہ رہی تھیں۔ جاتریوں نے اپنے عہد کے مطابق اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت سے پیر کبیر الدین حسن "حسن دریا" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (آب کوثر ص ۳۹۲/۳۹۳ بہاول پور گزیٹر)

"تاریخ اُچ میں ہے کہ سید کبیر الدین حسن کے پردادا سید شاہ شمس الدین سبزواری ۵۹۸ھ میں ملتان گئے اور وہیں ۶۷۵ھ میں وفات پائی (خزینۃ الاصفیا ۶ جلد دوم ص ۲۷۰) اور سید کبیر الدین حسن

سہروردی سلسلے کے ذکر و شغل میں مصروف رہے اور اُسی کی تلقین و ارشاد فرماتے رہے مگر آپ کی اولاد کا مذہب اثنا عشری تھا (تاریخ اُچ از مولوی حفیظ الرحمن) ۱؎

اخبار الاخیار میں سید کبیر الدین حسنؒ کی تاریخ پیدائش ۶۱۵ھ اور سن وفات ۸۹۶ھ دیا گیا ہے اور آپ کے مزار کا اُچ شریف میں موجود ہونا درج کیا گیا ہے۔ ۲؎

(۸) دلی کے پنجابی سوداگراں کا خوجہ کہلانا، شیخ بننا اور شمسی کا لقب اختیار کرنا

وادیٔ پنجند (قدیم پنجاب) کے مسلمان معززین خاص کر تجارت پیشہ خوجہ یا خواجہ کہلاتے تھے۔ کیوں کہ یہ لفظ کسی مخصوص برادری، قبیلے یا گروہ مسلک یا عقیدہ کے لئے نہیں تھا اور اس لفظ سے مراد متمول و معزز تھے بنا بریں مختلف مذاہب و ملل، رنگوں اور نسل کے وہ لوگ جو اس زمرے میں آتے تھے خوجہ کہلاتے تھے لوہانے کیوں کہ اکثر و بیشتر تاجر تھے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد ہندو رہی تھی لہٰذا نو مسلم لوہانوں نے اپنے قومی وقار اور اپنی قومی قدر کو قائم رکھنے کے لئے خوجہ کا لقب اختیار کر لیا یوں دلی کے پنجابی سوداگراں کا شمار خوجوں میں ہونے لگا۔

۱؎ تذکرہ صوفیائے پنجاب از اعجاز الحق قدوسی ص ۵۲۴ - ۵۲۸

۲؎ اخبار الاخیار (اردو) مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۴۴۹ - ۴۵۰

۱۸۴۵ء میں سلطان محمد خان آغا خاں ایران سے اپنے دو ہزار سواروں کی نفری کے ساتھ ہندوستان آئے۔ انگریز حکمرانوں نے انھیں خوش آمدید کہا۔ خوجوں کی عددی برتری اور ان کی کاروباری ساکھ سے متاثر ہو کر مذہبی عقائد کو سیاسی عزائم کے کام میں لانے کے لئے انھوں نے خوجوں کو سوادِ اعظم سے الگ ہو جانے کا حکم دیا ایسا کرنے سے خوجے مذہباً مشکوک ہونے لگے چنانچہ انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں ایک دعویٰ دائر کیا کہ خوجے عقیدۃً سُنی تھے ان کو سوادِ اعظم سے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن چونکہ انگریز کو اپنے عزائم کے لئے ایک بہت بڑے فرقے کی ضرورت تھی لہٰذا انگریز منصف نے خوجوں کے معقول و مدلل دعوے کے مقابل آغا خاں کا یہ مفروضہ تسلیم کرلیا کہ خوجوں کے پیر و مرشد نے تقیہ کیا تھا اور خوجوں کے مرشد شمس الدین سبزواری پر لگائی گئی تہمت قبول کر کے مقدمہ کا فیصلہ آغا خان کے حق میں دیا تو مجبوراً راسخ الاعتقاد سنی خوجوں نے اپنا لقب خوجہ کے بجائے شیخ اختیار کرلیا۔

اولاً لفظ شمسی خانوادہ گیلان پیر شمس الدین سبزواری کی اولاد نے [illegible] استعمال کیا اور وہ شمسی سادات کے نام سے معروف ہوئے۔ تاہم ہندوستان میں رائج طریقے کے مطابق جملہ عقیدت مندانِ شمس الدین سبزواری نے بھی شمسی کا لقب استعمال کرنا شروع کر دیا۔ رہا یہ سوال کہ پنجابی سوداگراں نے شمسی کا لفظ کیوں استعمال کیا تو اس کی صورت حال یہ ہے کہ جناب شیخ نفیس الحسن مرحوم

[illegible] اسماعیل از پیکلے

آبادی کی زیر صدارت دہلی میں تمام پنجابی سوداگران کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہمدرداں پنجابی سوداگران دلّی نے جو اس وقت اپنے مرکز یعنی دہلی سے دوسرے مقامات پر آباد تھے ایک دوسرے سے متعارف رہنے کے لئے لفظ شمسی کو بطور لقب استعمال کرنے کی تجویز پیش کی۔ باخبر اور معتبر لوگوں کے بیان کے مطابق کانفرنس میں تو یہ تجویز جملہ حاضرین نے منظور کر لی تھی مگر بعد میں کچھ ایسے لوگوں نے جو یا تو پنجابی نژاد نہ تھے یا پھر قوم لوہانہ سے ان کا تعلق نہ تھا اور اپنا علحدہ ملی تشخص برقرار رکھنا چاہتے تھے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس وجہ سے یہ لفظ شمسی برادری میں رواج نہ پا سکا۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مدرسہ شمس الھدیٰ پٹنہ واقع بہار کے فارغ التحصیل حضرات کا جو اپنے ناموں کے ساتھ لفظ شمسی لکھتے ہیں ان کا پنجابی سوداگران سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۹) پنجاب کے سماجی و معاشرتی حالات اور زبان

ہندو سوسائٹی قدیم زمانے سے مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر گروہ شادی بیاہ، کھانے پینے اور روزمرہ کی رسومات میں ایک دوسرے سے علحدہ ہے۔ ایسے گروہ کو ذات کہتے ہیں۔ ذات کی تعریف بتلاتے ہوئے پنڈت وشیوناتھ اور لالہ جگن ناتھ گولڈ میڈلسٹ سررشتہ تعلیم پنجاب نے اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھا کہ شروع شروع میں یہ تقسیم صرف پیشوں کے لحاظ سے کی گئی تھی اور ایک ذات سے دوسری ذات میں جانا مشکل نہ تھا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا ذات

پات موروثی بن گئی۔ یعنی پیدائش پر موقوف ہو گئی۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ذات پات کا نظام کب اور کن حالات میں وجود میں آیا۔ عام خیال یہ ہے کہ ویدک زمانے میں ذات پات کے نظام میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔ ذات پات کے فوائد بتلاتے ہوئے مصنفین مذکور نے لکھا ہے کہ ذات پات کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ ہر شخص اپنے باپ دادا کا پیشہ اختیار کرنے لگا اور یوں بہت سے علم و ہنر خاص خاص خاندانوں اور ذاتوں کے ورثہ میں آ گئے اور انھوں نے ان کو بہت ترقی دی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کا اخلاق اور چال چلن خاص کر اونچی ذات کا بڑی حد تک سدھر گیا کیونکہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ ذات پات کی وجہ سے وہ بدذات نہ بنا دیئے جائیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ اپنی اپنی ذات میں رہنے کی وجہ سے خون کی پاکیزگی برقرار رہی۔

یونانی سیاح میگستھنیز نے جو تین سو سال قبل مسیح میں ہندوستان آیا تھا اپنی نگارشات میں ہندو معاشرہ کو سات گروہوں میں منقسم کیا ہے۔

(۱) پہلا گروہ برہمنوں کا تھا۔ یہ عبادت گزار تھے جن کی عددی حیثیت بہت محدود تھی مگر سماجی مرتبہ اعلیٰ تھا۔ یہ لوگ محنت و مشقت سے مستثنیٰ تھے۔ ان کا ذریعہ معاشی دان پن، مذہبی ٹیکس یا نذر نذرانہ تھا۔

(۲) یہ گروہ کسانوں اور گلہ بانوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ اپنی محنت [illegible] سے نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے لئے بھی زمین سے پیداوار حاصل کرتا تھا اور اپنی حفاظت کے لئے پیداواری ٹیکس، لگان جو پیداوار کا [illegible] سالانہ حصہ ہوتا تھا ادا کرتے تھے اور زمین کا کرایہ بھی دیتے تھے۔

(۳) تاجروں، دستکاروں، صناعوں، معماروں اور ملاحوں کا طبقہ تھا۔ یہ گروہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسرے طبقے کے لیے بھی محنت ومشقت کرتا تھا اپنی پیداوار کے مطابق انکم ٹیکس ادا کرتا تھا جس میں مذہبی ٹیکس برہمنوں کے لیے اور انکم ٹیکس یا کھتری ٹیکس ملکی ٹیکس حفاظت کے لیے ہوتا تھا جو لوگ سامان جنگ تیار کر کے حکومت کو مہیا کرتے تھے وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ یہ طبقہ ہندو معاشرے میں اکثریتی طبقہ تھا۔

(۴) یہ گروہ مخبروں، سُراغ رسانوں اور جاسوسوں پر مشتمل تھا اپنی محنت وجاں فشانی کا معاوضہ کھتری ٹیکس سے وصول کرتا تھا اس کے فرائض میں رعایا کے حالات اور دوست دشمن کی نقل و حرکت سے حکام کو باخبر رکھنا شامل تھا۔

(۵) یہ گروہ سپاہ پیشہ افراد پر مشتمل تھا۔ ملک کی حفاظت کرنا امن وامان برقرار رکھنا اور سرکشوں کی سرکوبی ان کے فرائض میں شامل تھے۔ اس طبقے کے لیے زمانہ جنگ میں مروجہ اسلحہ گھوڑے، ہاتھی وغیرہ کی فراہمی حکومت اور ملک میں آباد دوسرے طبقوں کی ذمہ داری تھی۔ یہ طبقہ ہر وقت جنگی تعلیم حاصل کرتا رہتا تھا اور فن سپاہ گری کا ماہر ہوتا تھا۔ اسے زمانہ جنگ کے علاوہ زمانۂ امن بھی تنخواہ ملتی تھی۔

(۶) یہ گروہ بھاٹ یعنی داستان گو اور سرکاری ملازموں پر مشتمل تھا۔ ان میں بھاٹ ذریعہ ابلاغ احکام شاہی اور دیگر افراد ٹیکس وصول کنندگان ہوتے تھے۔ یہ اپنی کارکردگی کے مطابق تنخواہوں کے مستحق ہوتے تھے اور انعامات کے علاوہ جاگیروں سے بھی نوازے

جاتے تھے۔

(۷) یہ گروہ بادشاہ یا راجہ کی مشاورتی کونسل کے ارکان، ناظمین حکومت اور مختلف قبیلوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ انھیں میں سے صوبہ دار، منصب دار اور جاگیر دار متعین کیے جاتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر یہ امراء کا طبقہ تھا اور اس کی روزی اور عیش و عشرت رعایا کے ٹیکسوں پر منحصر تھی۔

منو ہندوؤں کا سب سے پہلا قانون داں یا قانون ساز گزرا ہے اسی نے ہندو قوانین کا مجموعہ تیار کیا۔ جس کو منو کا دھرم شاستر کہتے ہیں اس شاستر کے کچھ عرصے بعد موجودہ منوسمرتی نامی کتاب تصنیف ہوئی۔ اس کتاب میں جائداد کی تقسیم وحقوق اور قانونِ وراثت، راجا اور رعایا کے حقوق اور فرائض کے علاوہ چاروں ذاتوں یعنی برہمن، کھتری، ویش اور شودر کے متعلق بہت سی باتوں کے علاوہ انسانی زندگی کے مختلف حصوں یعنی چاروں آشرموں کے متعلق بھی درج ہے۔ علمائے ہنود کے بیان کے مطابق پنجاب میں ذات پات کا نظام منوسمرتی کی تالیف کے بعد عمل میں آیا۔ منو کی اسی درجہ بندی کو عوام ذات کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ ذاتوں کا یہ نظام جو منو نے معاشی بنیادوں پر برہمنوں کی اعلائی ومولائی قائم رکھنے کیلئے وضع کیا تھا۔ جو مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر نظام گوت (Sub - cante) کہلایا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد پر ہندی طرز تمدن دعوت اسلام میں اسی لئے سدراہ بنا کہ ہند میں ذات پات کا نظام ہندو سماج کا ایک کمزور اور قابل نفرت پہلو ہونے کے باوجود عوام کے دل و

دماغ پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ باوجود تکالیف کے وہ اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے خاص کر اس لئے کہ برہمنوں نے اپنی آقائی اور مولائی برقرار رکھنے کے لئے مسئلہ آواگون کو ذات سے منسلک کر کے کچھ اس انداز سے عوام کے ذہن نشین کر دیا تھا کہ عوام نے خود ھی ذاتوں کو موروثی قرار دے لیا تھا۔ چنانچہ صورت حال کے پیش نظر مسلم علمائے دین و دانش نے ہندی نظامِ ذات قطع و برید، حذف اور اضافہ کے ساتھ اسلامی اصول مساوات پر استوار کردہ نظام برادری نظامِ ذات کے مقابل ہندی طرز تمدن کو پیش کیا اور یہ بہت مقبول ہوا۔ اس طرح ذات پات کی رکاوٹیں دور ہوئیں اور تبلیغ اسلام کی راہ ہموار ہوئی۔

ہند میں یہ نظام برادری اس قدر مقبول ہوا کہ ایک طرف ارباب تجارت سے لے کر ارباب طرب نشاط اور دوسری جانب گداگروں سے لے کر شاہ گروں نے اپنی اپنی برادریاں قائم کیں اور کوئی مسلمان بغیر برادری اور کوئی ہندو بغیر ذات پات باقی نہ رہا۔

اسلام کی آمد پر نہ صرف پنجاب بلکہ پورے برصغیر کے ہندو سماج میں ذات کی تفریق، معبودوں کی کثرت اور معتقدات کے تنوع کا عجیب عالم تھا، اس سماج میں ناآشنائے تمدن وحشی قبائل مثلاً کشان، ہن وغیرہ کو اپنے میں ضم کر لینے کی گنجائش اس لئے تھی کہ وہ کسی نہ کسی عنوان سے مظاہر پرست یا بت پرست ہونے کے ساتھ اپنی تنومندی اور طاقت کے سبب ہر بات کا جواب بزورِ طاقت دیتے تھے۔ لیکن مساوات کے فقدان کی بنا پر اپنے ہی عوام یعنی اچھوتوں

(شودروں) کو برہمنوں وغیرہ کے ساتھ رہنے تک کی رعایت نہ تھی۔ وہ غریب اپنی کمزوری، جہالت اور ناواقفیت کی بنا پر برہمنوں کی تبلیغی موشگافیوں کا ھر وقت شکار بنے رہتے تھے۔ چنانچہ ہند میں وارد ہونے والے خون آشام اور جدال پسند اقوام کے افراد کو برہمنوں نے "اگنی کل" آتشی انسان کہہ کر اور کھتری کے خطاب سے نواز کر اپنے معاشرے میں جگہ دے رکھی تھی مگر اچھوت عوام اسی طرح برہمنیت کے پنجہ استبداد میں جکڑے ہوئے تھے۔

جب کسی مقام کے سماجی اور معاشرتی حالات بیان کئے جاتے ہیں تو وہاں کی زبان کا تذکرہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ جب ہم پنجاب کے سماجی اور معاشرتی حالات بیان کر چکے ہیں تو یہ جاننا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی زبان کیسے وجود میں آئی۔ مولانا نور احمد فریدی نے اپنی کتاب تاریخ ملتان حصہ دوم صفحہ ۴۳۶ پر پنجابی زبان سے متعلق لکھا ہے۔ " اردو کی پیدائش کے بعد بھی سرائیکی نے اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ عربی و فارسی زبانیں تو خواص تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں اور مدارس دینیہ میں ان کا خاصہ اثر تھا لیکن جالندھر سے کوہ سلیمان اور کشمیر سے کاشمور تک عوام پر صرف سرائیکی ہی کا قبضہ رہا۔ بابر کے زمانے میں جب گرونانک نے اس وادی (وادئ پنجند) میں نئے پنتھ کی بنیاد رکھی تو اس کے جانشینوں نے سرائیکی اور ہندی کے اختلاط سے ایک نئی زبان کو جنم دیا جو پنجابی کے نام سے موسوم ہوئی۔ سکھ فرقہ اپنی تحریروں کو مخفی رکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا اور وہ گورو کی مناسبت

سے گورمگھی کہلایا۔ رنجیت سنگھ نے اس زبان کو اپنے دربار کی رانی بنایا اور انگریزی دور میں مسلمانوں نے بھی پنجابی زبان کو اپنے سینے سے لگایا۔ صوفی شعراء میں سے شاہ حسین، سید بلھے شاہ اور سید وارث شاہ نے اسے اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اسی کے ذریعے عوام سے رابطہ قائم کیا۔

حضرت شاہ شمس سبزواری :- ساتویں صدی کے بہت بڑے مبلغ اسلام ہیں۔ آپ ۶۶۶ھ میں ملتان تشریف لائے۔ اور راوی پار جہاں اب ان کا مقبرہ ہے قیام فرمایا حضرت شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا علیہ الرحمۃ کی تاریخ وفات ۶۶۱ھ ہے۔ بنابریں حضرت شاہ شمسؒ کو حضرت شیخ الاسلام کا معاصر سمجھنا صحیح نہیں اس کے ساتھ ہی وہ تمام روایات اور حکایات جو عوام نے ان بزرگوں کے بارے میں مشہور کر رکھی ہیں بے اصل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

مولانا سید ابوظفر ندوی تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں کہ شاہ شمسؒ فرقہ نزاریہ کے داعی تھے۔ اور اسی فرقے کی معتقدات کی اشاعت کیلئے ملتان تشریف لائے تھے۔ لیکن ہمیں ان کے حالات میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی۔ جس سے ہم انھیں اس تہمت سے متہم کر سکیں۔

حضرت شاہ شمسؒ بھی سید جلال بخاریؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر اور حضرت محبوب الٰہی، نظام الدین اولیاءؒ کے آباء کرام کی طرح مغلوں کے حملوں سے متاثر ہو کر وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ خدائے ذوالجلال نے پاک و ہند میں ان سے اشاعتِ اسلام کا کام لینا تھا یہ حملے بہانہ بن گئے ۶۶۳ھ میں ہلاکو خان کے مرنے پر اباقا خان تخت نشین ہوا۔ ۶۸۱ھ تک حکمران رہا۔ اس کے عہد میں ہی شاہ شمسؒ نے سبزوار سے ہجرت فرمائی۔

شاہ شمسؒ نام کے تین بزرگ گزرے ہیں، ایک مولانا رومؒ کے مرشد ہیں۔ ان کی شہادت ۶۴۵ھ میں واقع ہوئی۔ دوسرے

شاہ شمسؒ سبزواری ہیں ۔ جن کا اس کتاب میں ذکر ہو رہا ہے ، تیسرے شاہ شمس عراقی ہیں جو ۹۳۲ھ میں کشمیر میں فوت ہوئے ۔ بعض تذکرہ نگاروں سے شاہ شمسؒ کے حالات جمع کرنے میں بڑی غلطی ہوئی ہے اور انھوں نے تینوں بزرگوں کے حالات کو گڈمڈ کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ حضرات جن کی معلومات سطحی ہیں بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ شاہ شمسؒ تبریزی اور شاہ شمسؒ عراقی سے بھی یہی بزرگوار مراد ہیں ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ شاہ شمسؒ عراقی کا مزار کشمیر میں ہے اور شاہ شمسؒ تبریزی قونیہ میں دفن ہیں ، حضرت شاہ شمسؒ کی تاریخ ولادت ۵۶۰ھ بتائی جاتی ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتی ، کیونکہ اگر اسے درست تسلیم کرلیں تو حضرت ملتان میں ۱۰۶ برس کی عمر میں تشریف لائے ہوں گے اور یہ سیر و سیاحت کی عمر نہیں ہے ۔

شاہ شمسؒ ایسے زمانے میں ملتان تشریف لائے جب کہ قرامطی فرقہ کے جراثیم ختم ہو چکے تھے ۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ فرقہ اہل سنت والجماعت کے امام تھے ۔ ان کے فیوض برکات سے اس فرقے کو فروغ ہوا ۔ اور دوسرے تمام فرقوں کے لوگ اس میں مدغم ہو گئے ۔ اس دور میں سید السادات جلال بخاریؒ مولانا عراقیؒ ، میر حسینیؒ ، سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ ، مولانا علاء الدینؒ اور شاہ یوسف گردیزؒ کے صاحب سجادہ موجود تھے جو اپنی اپنی جگہ پر دین اسلام کے بڑے ستون خیال کئے جاتے تھے ۔ شیخ الاسلام کی خانقاہ مہبط انوار بنی ہوئی تھی ۔ بیسیوں علماء آپ کے مدرسہ میں درس دے رہے تھے ۔ مدرسہ ناصریہ بھی بڑی بہار پر تھا ۔ ملتان کا گورنر

ملک شیر خان بلبن دینی امور میں سخت متشدد تھا ۔ ایسے حالات میں کسی کو نزاریہ فرقہ یا قرمطی معتقدات کی ترویج و اشاعت کی جرأت کیسے ہو سکتی تھی ۔ شیعہ مذہب ایک دور میں ملتان کا سرکاری مذہب بھی رہ چکا ہے ، مگر سلطان محمود غزنوی ، شہاب الدین غوری اور ناصر الدین قباچہ نے اہل سنت والجماعت فرقہ کی حوصلہ افزائی کی ، علماء اور مشائخ خواہ سہروردی تھے یا چشتی سب کے سب سُنّی مسلمان تھے ۔ اس لئے کئی صدیوں تک دوسرے تمام فرقے سواد اعظم کے آگے اُبھر نہ سکے ، یہ کیفیت صرف ملتان کی نہیں ، بلکہ کابل سے بنگال اور کشمیر سے دکن تک ہر جگہ مذہب اہل سنت والجماعت ہی رائج تھا ۔ اگر شاہ شمسؒ کا کوئی اور مذہب ہوتا تو وہ ملتان میں اہل وعیال کیلئے آشیانہ بنانے کی سعی نہ فرماتے اور واپس لوٹ جاتے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف یہاں آباد ہوئے بلکہ اہل سنت والجماعت مشائخ کے ساتھ گھل مل گئے ۔ چنانچہ شیخ رکن الدینؒ کو "رکن الدین والعالم" کا لقب آپ ہی نے عنایت فرمایا تھا جو بعد میں کثرت استعمال سے "شاہ رکن عالم" ہو گیا ۔ ملتان میں شیعہ مذہب کا دوبارہ احیاء لنگاہ کے زمانے کے آخری دور میں ہوا ہے ، فرشتہ لکھتا ہے کہ شاہ محمود لنگاہ کے زمانے میں میر عماد گردیزی مع اپنے دو لڑکوں میر شہید اور میر شہداد کے سیوی کی طرف سے آیا ۔ اور جس شخص نے سب سے پہلے ملتان میں شیعہ مذہب کی اشاعت کی ۔ وہ یہی میر شہداد تھا اس کے بعد بیرم خان خاناں مرزا غیاث ، اور علی قلی خان وران جیسے کئی اور اکابر امراء ایران سے آئے جو مذہباً شیعہ تھے ۔ اس سے شیعہ مذہب

کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ حضرت شاہ شمسؒ کے مقبرہ کی مسجد میں خلفائے راشدین کے نام کی روغنی تختیاں محراب کے اوپر پیوست ہیں۔ یہ لنگاہوں کے دور سے قبل کی معلوم ہوتی ہیں، نیز آپ نے جن قبائل کو مسلمان کیا ہے۔ ان میں سے اکثر وبیشتر سنّی ہیں۔ بالخصوص گریجے وغیرہ۔ ان حقائق سے حضرت شاہ شمسؒ کے معتقدات پر روشنی پڑتی ہے۔

بندہ نے خود دربار شریف پر جاکر ان تختیوں کا برأی العین مشاہدہ کیا ہے بلاشبہ یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ کسی زمانے میں اس خانقاہ اور مسجد پر سنّی مسلمانوں کا قبضہ رہا ہے۔ پھر حیرت یہ ہے کہ شیعہ متولّیوں نے بھی اپنے زمانۂ اقتدار میں ان تختیوں کو اکھڑوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صاحب تذکرۃ الملتان شاہ شمسؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ آپ ملتان کے اولیائے کبار میں سے ہیں۔ آپ بڑے عابد، زاہد اور عارف کامل تھے اس لئے تمام اسماعیلی ارادت رکھتے ہیں۔

دوسرا باب

(۱۰) دلی کے پنجابی سوداگران کا پنجاب سے ترک مکانی

یہ امر واقعہ ہے کہ دلی کے پنجابی سوداگران کے آباؤ اجداد نے نہ تو عنایت خسروانہ و مراعات شاہی اور نہ ہی محلاتی سفارش کے سبب ترک وطن کیا۔ بلکہ ان کے اسباب و علل خالصتاً معاشی تھے۔ جب تک ملک بھر میں خشکی کے راستے پرخطر رہے اور تجارت دریائی راستوں سے ہوتی رہی۔ وادئ پنجند یا قدیم پنجاب اپنے جغرافیائی محل وقوع کے سبب ایک بہت بڑا تجارتی مرکز (بندرگاہ) بنا رہا۔ وہاں کے باشندے یعنی پنجابی سوداگران اپنے وطن مالوف کے وسائل سے فیضیاب ہوتے رہے سڑکیں تعمیر ہو جانے کے بعد جوں ہی راستے پُرامن ہوئے اور تجارت دریاؤں کے راستے سے ہٹ کر خشکی کے راستے ہونے لگی تو قدیم پنجاب یعنی وادئ پنجند کی تجارتی اہمیت روبہ زوال ہو گئی اور باشندگان پنجاب بالخصوص پنجابی باشندگان نے ترک مکانی شروع کیا۔ کچھ نے صوبہ لاہور کا رُخ کیا اور کچھ نے ملتان، انبالہ، جالندھر میں قیام کیا اور پھر وہیں آباد رہے۔ دلی کے پنجابی سوداگران کے آباؤ اجداد نے ترک مکانی کر کے دلی میں قیام کیا۔ لہٰذا ان کے متعلق اگر کوئی

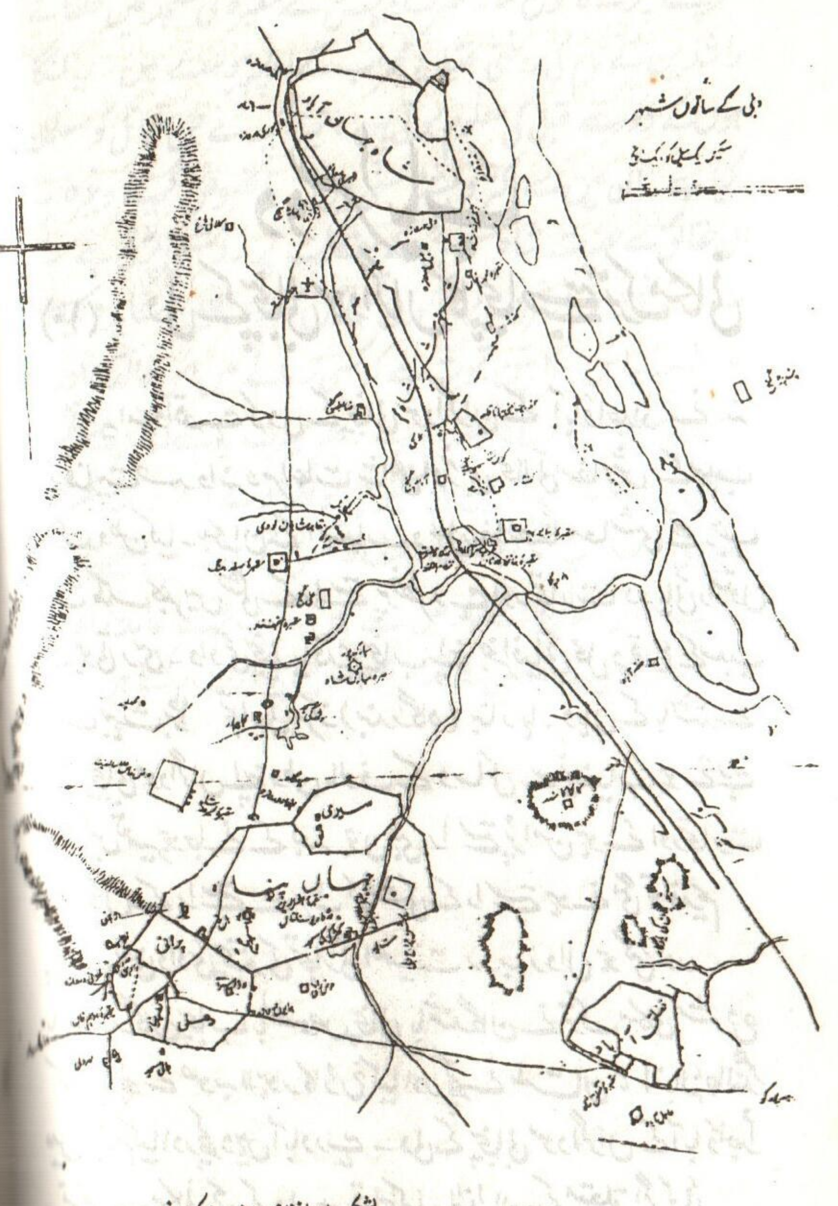

بشکریہ! حافظ محمد انور (کھلونے والے)

ہے جو داستان بیان کی جاتی ہے تو اس کا تسلیم کرنا مشکل ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی اور نہ ہی منطقی دلائل سے اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے اور تاریخی شواہد بھی اس کے خلاف ہیں

(۱۱) قدیم پنجابی سوداگراں کی دھلی میں آمد

۱۶۱۲ء میں جس وقت نورالدین جہانگیر ہندوستان کا شہنشاہ تھا اور اس کا دارالسلطنت اگرہ تھا، دہلی کو قدامت کے سوا دوسرا کوئی امتیاز حاصل نہ تھا۔ برصغیر کی ہندی تجارت عروج پر تھی اور اس میں لاہور و ملتان کے تاجر پیش پیش تھے۔ ہر جگہ تجارت پر مقامی تاجر چھائے ہوئے تھے۔ بنا بریں ایرانی و خراسانی تاجروں کے ساتھ قدیم پنجابی سوداگراں کو بھی ان کے مقابلہ میں پیر جمانا مشکل تھا۔

حالات سے متاثر ہو کر ایرانی و خراسانی تاجروں کے ملک التجار اور جہاں گیر کے معتمد خاص مہربان آغا نامی ایک ایرانی شخص نے جو اپنے کاروباری تعلقات کی بنا پر قدیم پنجابی سوداگراں کا تجارتی دوست تھا قدیم پنجابی سوداگران کے مشورے سے شاہراہ اعظم کے وسط اندرون دہلی شیر شاہ کی تعمیر کردہ سرائے روح اللہ خاں کے نزدیک ایک تجارتی بستی آباد کی جس کا نام منڈی رکھا۔ اس منڈی کی تعمیر کے بعد قدیم پنجابی تاجر یا دلی کے پنجابی سوداگران کے اجداد نے جو جدی تاجر ہونے کی وجہ سے فطرةً دوسرے تاجروں کے مقابلے میں تجارتی معاملات میں نہ صرف زیادہ موقع شناس تھے بلکہ پنجابی تجارت

کے رو بہ زوال ہونے کے سبب کسی نئے تجارتی مرکز کے متلاشی تھے بیرون دہلی نو تعمیر شدہ تجارتی بستی منڈی میں آباد ہو کر تجارت میں مشغول ہو گئے۔

(۱۲) دہلی کے معاشرتی حالات

اس سے پہلے کہ دہلی کی ایک مضافاتی بستی میں آباد ان دلی کے پنجابی سوداگران کا معاشرتی احوال بیان کیا جائے شہر دہلی کا کچھ احوال بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ ان میں قائم مختلف برادریوں کو کیوں ایک برادری کے وفاقی ادارے کی ضرورت پیش آئی۔

جب شہاب الدین شاہجہاں برسر حکومت آئے تو آگرہ ملک کا دارالسلطنت تھا۔ دلی کو قدیم ہونے اور شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ جرنیلی سڑک کے کنارے واقع ایک تجارتی منڈی ہونے کے علاوہ اور کوئی خوبی حاصل نہ تھی۔ جب شاہجہاں نے آگرہ کے بجائے دلی کو اپنا دارالخلافہ بنانے کا ارادہ کیا تو گویا دلی کے بھاگ جاگ اُٹھے شاہجہاں کے حکم سے یہاں قلعہ، جامع مسجد اور محلات تعمیر کئے گئے جو سب ہی عالیشان تھے۔ قلعہ سنگ سرخ سے تعمیر کیا گیا۔ اس لئے لال قلعہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مسجد میں بادشاہ کیوں کہ خود جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے۔ اس لئے اسکو جامع مسجد کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ محلات مختلف تھے اس لئے ان کو مختلف ناموں سے منسوب کیا گیا۔ لال قلعہ مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کا مرکز تھا۔ کلاں محل اور

زینت محل کے علاوہ یہاں متعدد عمارات اور بازار تھے جن میں سامان تعیش (لوازمات حسن) ہیرے جواہرات کے علاوہ سیمیں و طلائی ظروف اور اطلس و کمخواب کے پارچہ جات فروخت ہوا کرتے تھے۔ شاہجہاں کا دور ہند میں مسلمانوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کو جو سکون و عزت، شان و عظمت اور فارغ البالی اس دور میں نصیب ہوئی وہ نہ اس سے قبل حاصل تھی اور نہ کبھی بعد میں اس کا موقع ملا۔

دلی کے دارالسلطنت بن جانے اور عروس البلاد کا درجہ حاصل کر لینے سے پہلے ہی پنجابی سوداگراں کی تجارت دلی میں عروج پر پہنچ چکی تھی اور یہ سوداگران اس وقت کے مروجہ قاعدے کے مطابق اپنی اپنی تجارتی اشیاء کے ناموں سے قائم کردہ مختلف برادریوں میں منقسم تھے لیکن ان برادریوں کا کوئی وفاق ظہور میں نہیں آیا تھا۔

شاہجہاں کی رعایا پروری اور مراعات شاہی سے فیضیاب ہونے کے لئے جب دہلی کے اطراف و اکناف سے آنے والے تجارت پیشہ افراد نے "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز" کے مصداق تجارتی منڈی میں رہائش اختیار کر کے کاروبار شروع کیا تو پنجابی سوداگران کے معاشرے کو خطرہ پیدا ہو گیا۔

پشتینی تاجر ہونے کے ناتے پنجابی سوداگران امور تجارت میں تو کمال [illegible] رکھتے تھے اور طبعاً اسی کے شائق تھے۔ مگر ان کی طبیعت [illegible] کی طرف مائل نہ تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ کافی مدت تک وہ ایک سہل [illegible] یعنی ہندی سے کا کام چلاتے رہے کیوں کہ یہ نو مسلم تھے

اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ہندوؤں سے ان کا میل جول جاری رہا اور رسم و رواج کے معاملے میں بھی ان کا طرزِ عمل کم ہی تبدیل ہوا تھا اس لئے وہ ہندوستانی اور اسلامی ثقافت کا ایک ملا جلا مرقع تھے

نو وارد تاجر اگرچہ جدی پشتینی تاجر نہ تھے مگر جاگیردارانہ نظام کے پروردہ اور نسبتاً زیادہ تعلیم یافتہ تھے لہٰذا ان کے اختلاط سے پنجابی سوداگران کے معاشرتی حالات میں انتشار پیدا ہونا ایک بدیہی امر تھا۔ انتشار کی وبا کو روکنے کے لئے اور مختلف برادریوں میں منقسم پنجابی سوداگران کو ایک مرکزیا پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی غرض سے بزرگوں نے مل جل کر اور صلاح مشورے سے پنجابی سوداگران کی برادری کے ایک وفاق کی بنیاد ڈالی۔ اس میں ہر پنجابی برادری کا ایک نمائندہ شامل کیا گیا۔ اسطرح پنجابی سوداگران کی برادریوں کو یکجا ہونے کا موقع ملا۔ برادریاں حسب سابق اپنی جگہ برقرار رہیں اور انھوں نے اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لئے اپنی برادری کا نشان امتیاز اپنے ناموں کے ساتھ برقرار رکھا۔ ان برادریوں میں چودھری بھی تھے اور چودھری کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اس کی برادری میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسری برادری میں شادی خواہ وہ لڑکے کی ہو یا لڑکی کی بغیر چودھری کی مرضی یا اجازت کے نہیں کی جا سکتی تھی

دلی کے پنجابی سوداگران کے معاشرے میں اولین شرط شمولیت پنجابی نژاد ہونا اور دوم سوداگر ہونا ضروری تھا۔ اور جب تک چودھری کسی شخص کے متعلق ان امور کی تسلی نہیں کر لیتا تھا اسے اپنے زیر اثر برادری میں شمولیت یا ذیلی برادری کے لوگوں کو اس

میل جول کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس طرح لفظ "پنجابی" نے ان لوگوں کو ممیز اور ممتاز رکھا۔

چودھری کو اپنے زیر اثر اہل برادری کو پنچایت کا فیصلہ نہ ماننے کی صورت میں سزائے مقاطعہ (بائیکاٹ) کا بھی اختیار تھا۔ چودھری کے فرائض منصبی میں یہ شامل تھا کہ وہ پوری برادری کے حالات سے باخبر رہے۔ اہل برادری کے دکھوں اور خوشیوں میں شریک ہو ان کی تکالیف کا مداوا کرے، ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کرے۔ دو برادریوں کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو سلجھانے اور طے کی ذمہ داری وفاقی سربراہ یا سرپنچ کی تھی۔

(۱۳) دھلی کا تذکرہ

بوجہ قدامت دہلی کی قدیم تاریخ ابتک پردۂ راز میں ہے اور باوجود کوشش و تحقیق اس کا پتہ نہیں لگایا جا سکا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی قدیم تاریخ کی بنیاد صرف قیاسات پر ہے سر ہنری ایلیٹ نے محکمہ آثار قدیمہ کی راہ نمائی سے لکھا ہے کہ یہ ایک سربستہ راز ہے کہ اندرپرستھ کی جگہ دہلی نے کب لی اور باوجود عالمانہ تفتیش و تحقیق کے راز قابل اطمینان طور پر کھل نہیں سکا ہے۔ اندرپرستھ کی جگہ دہلی نے کب لی اس کا کوئی ثبوت آج تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ تاریخی لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں اجین کے راجہ بکرماجیت نے اندرپرستھ پر اس وقت حملہ کیا تھا جب یہ کماؤں کے راجہ سوکنتا کے قبضہ میں تھا۔ مسٹر ٹیلبائز وہیلر رقمطراز ہے کہ

بکرماجیت نے کماؤں کے راجہ کو شکست دے کر اندرپرستھ حاصل کیا تھا لیکن اس کے آٹھ سو سال بعد تک یہ ..... دارالسلطنت نہ بن سکا۔ اس کے بعد راجہ اننگ پال نے .... از سر نو اس کو آباد کیا اور بجائے اندرپرستھ اس کا نام دہلی پڑا بہر نوع اس امر کا کوئی حتمی فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ کماؤں کے راجہ کے ہاتھ سے اندرپرستھ نکل جانے کے کتنے عرصے بعد اس کا نام دہلی پڑا۔ یہ بات البتہ اپنی جگہ درست معلوم ہوتی ہے کہ راجہ بکرماجیت سے پہلے دلی کا وجود نہیں ملتا۔ یہ زمانہ تاریخی لحاظ سے ۵۷ء کے قریب کا تھا اور اس زمانے کے ہندوستان کے تاریخی حالات یونانی مورخین نے قلم بند کئے ہیں لیکن ان تذکروں میں بھی دلی کا نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ اس کے بعد گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمان حملہ آور ہوئے اور ان کے حملوں کے تذکروں میں بھی دہلی کا ذکر نہیں ملتا۔ اس سے قبل بھی چینی سیاح ہونگ شیانگ کے تذکرے میں جو چوتھی صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا اور پھر دسویں صدی میں البیرونی کے تذکرے میں جو اس وقت ہندوستان میں سنسکرت کا مطالعہ کر رہا تھا دلی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے کے مورخ یمنی (مورخ تاریخ یمینی) نے بھی دہلی کا کوئی ذکر نہیں کیا حالانکہ دہلی کے آس پاس کے چار مقامات یعنی قنوج، میرٹھ، پانی پت کے علاوہ کیتھل تک کا ذکر کیا ہے۔ متھرا کا محاصرہ اور فتح تک کا واقعہ لکھا ہے

مورخوں اور سیاحوں کے طرز عمل سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے حملے کے وقت یا تو دہلی کا نام

نہ تھا یا اگر وجود تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اس وقت دہلی کسی شمار و قطار میں نہ تھی جو قابل ذکر ہو۔

قبل اس کے کہ دہلی کے ابتدائی تاریخی زمان و مکانی کا تعین کیا جائے، اس کی وجہ تسمیہ کی مختلف روایات اور اس کے بانیوں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ یہ خیال کہ دہلی راجہ دلیپ کی بسائی ہوئی ہے اب متروک ہے۔ مگر یہ بات مسلّم ہے کہ اندرپرستھ دہلی سے بہت پہلے آباد ہوا تھا اس کے ساتھ ہی یہ خیال کہ دہلی کو راجہ یدھشٹر کے آباؤ اجداد نے آباد کیا تھا ناقابل قبول ہے اور مسٹر بگلر کا یہ خیال کہ دہلی اور اندرپرستھ دونوں شہر ایک ہی وقت میں آباد تھے تاریخی اعتبار سے غلط ہے اس کے ساتھ ھی یہ بھی غلط ہے کہ دہلی کو تنوار خاندان کے راجاؤں نے ۹۱۹ء ق م میں آباد کیا تھا یا یہ کہ لفظ دہلی کا ماخذ ہندی کا لفظ "دھیلی" ہے جس کے معنی نرم زمین کے ہیں، البتہ یہ روایت کہ راجہ دیلو کے قنوج کے مقبوضات میں ایک مقام دتی بھی تھا جہاں سروپ دت نامی گورنر متعین تھا جس نے اندرپرستھ کے ویران شدہ مقام پر دلی شہر آباد کیا تھا اور اپنے راجہ دیلو کے نام پر اس کا نام دلی رکھا [illegible] ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ دیلو کا دور حکمرانی ۳۲۶ء ق م تھا اور یہی راجہ پورس والی کماؤں کا ہمعصر تھا۔ یہ راجہ پورس وھی ہے جس پر سکندر یونانی نے حملہ کیا تھا۔ جنرل کننگھم کا بیان ہے (یہ بیان [illegible] سے نقل کیا گیا ہے) کہ دلی نام سب سے پہلے راجہ

پورس کے زمانہ میں لوگوں کی زبان پر آیا اور بقول کرنل ٹاڈ آٹھویں صدی تک دلی پر کوئی حکمران نہ تھا اس کے بعد تنوار خاندان کے راجپوتوں نے جو تاریخ میں کورد پانڈوں کہلاتے تھے اس پر قبضہ کرلیا بعد ازاں ننگ پال سوم نے اپنے پوتے پرتھی راج کے لئے اس کا تخت خود ہی خالی کردیا۔

گیارہویں صدی عیسوی میں جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو دلی ایک معمولی بستی تھی اس لئے اس کو قابل توجہ نہ سمجھا۔
۱۵۲۶ء میں پانی پت کی لڑائی اور لودھی خاندان کی تباہی کے بعد ہندوستان کا مغل بادشاہ بابر آگرہ میں تخت نشین ہوا۔ واضح رہے کہ اس وقت آگرہ ہی دارالسلطنت تھا۔

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بھی اگرہ میں اس وقت تک رہا جب تک کہ ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری نے اس کو ہندوستان بدر کردیا اور پھر ۱۵۵۶ء میں ہمایوں دوبارہ ہندوستان آیا تو سٹرک اعظم بن جانے کی وجہ سے دلی کی اہمیت میں اضافہ ہوچکا تھا چنانچہ اس نے بجائے آگرہ "دہلی میں قیام کرنا" پسند کیا۔ ہمایوں کے قیام دہلی سے اس کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ مگر بھر چھ ماہ بعد جب ہمایوں کا دہلی میں انتقال ہوگیا تو اس کے بیٹے اکبر نے دہلی کو نظرانداز کرکے آگرہ ہی کو دارالسلطنت قرار دیا۔ صدود دہلی میں اپنا ایک نائب السلطنت متعین کرکے اس کو ایک صوبہ کا درجہ دے دیا۔

آئین اکبری کے مطابق دلی صوبے کا رقبہ دو کروڑ پچاس لاکھ چھیالیس ہزار آٹھ سو سولہ بیگھے اور سولہ بسوے تھا۔ یہ تمام رقبہ آٹھ سرکاروں

اور دو سو تیس پرگنات پر منقسم تھا۔

صوبہ دہلی سرکار میں (۱) پانی پت (۲) پالم (۳) باغپت (۴) پلول (۵) جھجر (۶) جنجھانا (۷) جلال پور یا بروت (۸) داسنہ (۹) رہتک (۱۰) سونی پت (۱۱) کرنال (۱۲) گڑھ مکتیشر (۱۳) کاندلہ (۱۴) میرٹھ اور (۱۵) ہاپڑ۔ صوبہ دہلی کی سرکار بدایون میں (۱) اکولہ اور بریلی شامل تھے۔ سرکار سہارنپور میں (۱) رام پور (۲) رڑکی (۳) دیوبند (۴) گنگوہ (۵) لکھنوتی اور (۶) نانوتہ شامل تھے۔ سرکار سنبھل میں امروہہ، بجنور، جلال آباد، دوراہ اور سمانہ اور سرکار سرہند میں انبالہ بھٹنڈہ، تھانیسر شامل تھے۔

اکبر کے بعد جہانگیر بھی آگرے ہی میں رہا۔ اس کے عہد حکومت میں ماسوائے بیرون شہر ایک تجارتی بستی آباد ہونے کے جس کو اسی کے ایک معتمد خاص مہربان آغا نامی شخص نے بسایا تھا دہلی میں کوئی کمی اور اضافہ یا تعمیر و ترقی نہیں ہوئی۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں کی تخت نشینی کا جلسہ بھی اس کے جد امجد کے محل میں آگرہ ہی میں ہوا۔ گیارہ برس بعد جب جاہ و حشم کے ہجوم کے لئے آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں گنجائش نہ رہی تو شاہجہاں نے دلی کو دارالسلطنت مقرر کرنے کا قصد کیا۔ نجومیوں اور مشائخین کے مشورے سے یہ جگہ جہاں اب قلعہ ہے قلعہ کی تعمیر کے لئے منتخب ہوئی۔ اور پھر قلعے کے اطراف شہر شاہ جہاں آباد کی بنیاد ڈالی جس کو بالعموم دہلی کہا جاتا تھا۔ اور شاہجہاں آباد میں ایسا قلعہ بنوایا

جو آگرہ کے قلعہ سے دوگنا اور لاہور کے قلعہ سے کئی گنا زیادہ وسیع و عریض تھا۔

واقعات دارالحکومت دہلی کے مصنف جناب بشیرالدین احمد مرحوم کے بیان کے مطابق دلی کے ویرانے پینتالیس مربع میل میں پھیلا ہوا تھا اور اس میں تیرہ دارالسلطنتیں وجود میں آئیں۔ سن عیسوی سے پندرہ سو برس پہلے راجہ یدھشٹر نے پانڈوؤں کی ایک بڑی سلطنت قائم کی جمنا کے کنارے اپنی راجدھانی قائم کی اور اس کا نام اندرپرست رکھا۔ یدھشٹر کا خاندان تیس پشت تک حکمرانی رہا۔ اس کے بعد گوتم بنتیوں کا نمبر آیا۔ گوتم خاندان کے ایک شخص سروپ دت نامی نے جو حاکم قنوج کی فوج کا لیفٹیننٹ تھا اپنے راجہ دیلو کے نام پر دلی شہر بسایا۔ گوتموں کے بعد دھرم واج یا دھرتی دھر کے خاندان کے آخری راجہ نے اجین کے راجہ سے شکست کھائی جن کی حکومت بعد میں جوگیوں کے خاندان میں سمندر پال کو منتقل ہوئی۔ جوگیوں کے بعد ملک پراودھر بہراج کے راجاؤں کا دور آیا۔ انکے بعد فقیر دلی کا خاندان برسرِ حکومت رہا، خاندان فقراء انکے بعد بلدول سین حکمراں ہوا، سینوں کے خاندان کا قلع قمع دیپ سنگھ کوہی سوالگ والے نے کیا۔ اسے اننگ پال اوّل بانی خاندان تنوار نے دلی سے نکال باہر کیا اور ۷۳۱ء میں دلی کو از سر نو آباد کیا اس اس کے بعد اسی خاندان کے ایک رکن اننگ پال دوم نے ۱۰۵۶ء میں پھر سے آباد کیا۔

اس کے بعد ۷۹۲ برس تک دلی شمالی ہند کے دارالسلطنت کے رتبہ سے گری اور کسمپرسی کی سی حالت رہی۔ یہ زمانہ راجہ

اجین کی فتح اور اننگ پال ثانی کے دوبارہ دلی کو آباد کرنے کے درمیان کا ہے۔ ۱۱۵۵ء میں تنوار کے خاندان کے آخری راجہ کو چوہانوں نے شکست دی۔ خاندان چوہان کے آخری راجہ پرتھوی راج المعروف بہ رائے پتھورا کا نیر اقبال شمالی ہند میں چمکنے لگا اور اس نے اپنے نام پر ایک قلعہ "قلعہ پتھورا" تعمیر کرایا۔ ۱۱۹۱ء میں مسلمانوں کا دور شروع ہوا اور قطب الدین ایبک نے قطعی طور پر دلی کو فتح کیا۔ اسی زمانے میں شمالی ہند میں ہندوؤں کا راج ختم ہوا۔

قطب الدین کے بعد پہلے آٹھ بادشاہوں نے قلعہ رائے پتھورہ میں رہ کر ہی حکمرانی کی اور اپنی مرضی اور ضروریات کے مطابق اس میں کمی و اضافہ، تعمیر و انہدام کیا۔ ان میں محلات شاہی کے علاوہ ایک مسجد بھی بنوائی گئی اس وقت اگرچہ ان کے تعمیر کردہ محلات باقی نہیں۔ البتہ ایک مسجد اور شیر منڈل کا برج باقی ہے جو سلاطین اسلام کی عمدہ یادگار اور بہترین نشانیاں ہیں۔

سیدوں کے بعد لودھی حکمراں ہوئے انھوں نے شہر کی صورت میں کوئی نشانی نہیں چھوڑی۔ بہلول شاہ بانی خاندان لودھی میری میں رہتا تھا۔ اس کا بیٹا نظام خان سکندر شاہ لودھی کچھ عرصے میری میں رہا پھر آگرہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ ۱۵۲۶ء میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر جب قبضہ کیا تو آگرہ دارالسلطنت تھا۔ چنانچہ اس نے دلی میں اپنا نائب مقرر کیا اور خود آگرہ میں رہا۔ بابر کے بعد ہمایوں جلاوطنی سے پہلے آگرہ ہی میں رہ کر حکومت کرتا رہا۔ ۱۵۴۰ء میں اس کو شیر شاہ سوری نے جلاوطن

گیا ۔ چودہ برس بعد ۱۵۵۵ء میں جب وطن واپس آیا تو دہلی میں مقیم ہوا ۔ جلا وطنی سے پہلے ہمایوں بھی اپنے پیشرو حکمرانوں کی تقلید میں ایک نئے شہر دین پناہ کی بنیاد رکھ چکا تھا مگر قسمت نے یاری نہیں کی اور وہ وطن واپسی کے تھوڑے عرصے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گیا ۔ شیر شاہ سوری نے بھی اگلے بادشاہوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک نئے شہر شیر گڑھ یا دہلی شیر شاہی کی بنیاد ڈالی ۔ ۱۵۴۶ء میں اس کے بیٹے سلیم شاہ سوری نے دریائے جمنا کے کنارے پر سلیم گڑھ نامی قلعہ تعمیر کرایا ۔ ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے دہلی پر قبضہ کیا مگر چھ ماہ بعد ہی انتقال کر گیا ۔ بعد ازاں اکبر یعنی جلال الدین محمد اکبر فرزند ہمایوں جانشین ہوا ۔ جو آگرہ ہی میں تخت نشین ہوا ۔ اس کے بعد اکبر کا بیٹا جہانگیر بھی آگرہ ہی میں مقیم رہا ۔ جہانگیر کے بعد دہلی کے بخت خفتہ بیدار ہوئے اور شاہجہاں نے اپنا دار السلطنت آگرہ سے دہلی منتقل کیا تو اس کا نام شاہ جہاں آباد رکھا ۔ یہ ہی شاہجہاں آباد دہلی یا دلّی کہلاتا ہے مگر انگریز اس کو ڈلہی کہتے تھے

طرز رہائش :۔ پنجابی سوداگران دلی دور مغلیہ کے اختتام تک بیرونِ دہلی جانب مشرق واقع ایک تجارتی بستی بنام منڈی کے محلہ کٹرہ اور بستی پنجابیاں کلاں میں اس طرح مقیم رہے کہ اپنے دو منزلہ مکانات میں رہائش بھی رکھتے تھے اور کاروبار بھی کرتے تھے کاروبار نچلی منزل میں کیا جاتا تھا اور رہائش کے لئے بالائی حصہ مخصوص ہوتا تھا ۔ جنگ آزادی کے ناکام خاتمہ پر جب ابنائے وطن کے علاوہ دیگر مسلمانوں نے بھی نیلام میں خریدے ہوئے محلات اور مکانات

بارہ دریوں احاطوں اور حویلیوں میں اقامت گزینی شروع کی تو پنجابی سوداگران بھی آگے بڑھے اور اپنے کاروبار و رہائش کو علیحدہ کر لیا ۔ کسی نے شہر پناہ کے باہر صدر بازار میں، کسی نے شہر کے اندر چاندنی چوک یا فتح پوری کے بازاروں میں اپنا کاروبار جما لیا اور رہائش کے لئے محلات نما مکانوں میں فروکش رہے ۔ جن پر جملہ پُر تکلیف آسائشوں کے ساتھ دالان در دالان ڈیوڑھیاں اور کشادہ صحن کے علاوہ ایک مردانہ حصہ بھی ہوتا تھا جس کو یہ حضرات ٹھک کہتے تھے ۔

لباس :۔ ابتداً یہ لوگ عام لباس پہنتے تھے رفتہ رفتہ تبدیلیاں آتی رہیں اور بالآخر بہت سی قطع برید کے ساتھ ایک خاص وضع پر پہنچے جس سے وہ الگ پہچانے جانے لگے ۔ ان کا پاجامہ شرعی ہوتا جس کی مہریاں خاص وضع کی ہوتیں ۔ کُرتے سادے بھی ہوتے ۔ پہلے یہ لوگ انگرکھے پہنا کرتے تھے پھر اچکن پہننے لگے کھلے کالر کا کوٹ پہننے کا رواج بہت بعد میں ہوا ۔ ٹوپی گول سوزنی یا ریشم کی کڑھی ہوئی سر کے بال خشخشی اور ڈاڑھی کا رواج تھا بعد میں داڑھی صاف کرنے کا رواج بھی ہو گیا ۔ پان کھانے کا رواج عام تھا ۔ مگر حقہ صرف معمر لوگ ہی پیتے تھے ۔ سگریٹ اور چائے کا رواج بالکل نہ تھا البتہ بہت بعد میں سگریٹ نے رواج پایا ۔ مستورات آڑا یا چوڑی دار پائجامہ پہنتی تھیں ۔ شلوار کا رواج بہت بعد میں ہوا ۔ ساڑھی کا رواج قطعی نہ تھا ۔ زیور ایک سے ایک عمدہ جڑاؤ اور سادہ قسم قسم کا پہنتی تھیں ۔ کرتوں میں سونے کے بٹن لگاتی تھیں ۔ دوپٹوں پر بیل فیتہ لگانے کا رواج بھی عام تھا ۔ ہلکے

باریک کپڑوں کو موٹے کپڑوں پر ترجیح دیتی تھیں ۔

خوراک :- یہ لوگ کھانے پینے کے معاملے میں فراخدل ہونے کے ساتھ خوش ذائقہ کھانوں کے عادی ہیں ۔ چنانچہ نہاری، دوٹے کے کباب، دہی بڑے اور کچالو کی چاٹ ان کے من بھاتے کھانوں میں شامل ہیں ۔ ان کے معاشرے میں چوں کہ امور خانہ داری سے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری خواتین پر ہوتی ہے اس لیئے وہ بہترین منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اچھے سے اچھا کھانا پکانے کی صلاحیت رکھتی ہیں ۔ کھانوں کے علاوہ اچھے قسم کے مشروبات اور پھل بھی یہ لوگ بہ کثرت استعمال کرتے ہیں ۔

زبان اور تعلیم :- یہ پنجابی سوداگران ابتداً سرائیکی زبان بولتے تھے ۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ موجودہ پنجابی اور اُردو ان کے دہلی آنے کے وقت تک نہیں بولی جاتی تھی اور پنجابی سکھ دورے حکومت کی یادگار ہے ۔ ایک سہل ترین تحریر ہندی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی وہی ان کے اظہار کا ذریعہ تھا ۔ حساب کتاب لکھنے کے لیئے تقسیم ہند سے پہلے تک اکثر لوگ یہی تحریر استعمال کرتے تھے ۔ اب تو بہت کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس کو لکھ یا پڑھ سکیں ۱۹۰۹ء میں انجمن وکیل قوم پنجابیان کے لیئے رجسٹریشن کے لیئے دی جانے والی درخواست پر سات حضرات میں سے دو کے دستخط کا اس تحریر میں ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ پشتینی تاجر ہونے کے سبب ان کی طبیعت مائل بہ تعلیم نہ تھی ۔

۱۷۷۲ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس ہونے تک ایسٹ انڈیا کے

مقبوضات میں جنگل کا قانون نافذ تھا ۔ پارلیمنٹ نے یہ ایکٹ منظور کر کے کمپنی پر کچھ پابندیاں عائد کیں اور پھر چالیس سال بعد ۱۹۳۳ء میں چارٹرڈ ایکٹ کی رد سے کمپنی کو برصغیر میں تجارتی مراعات سے محروم کر کے اس کے اختیارات انتظامی مسائل تک محدود کر دیئے گئے تو کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کو کمپنی کے سابقہ ملازمین کی جگہ نئے ملازمین کی ضرورت پیش آئی ۔ چوں کہ فروغ تجارت کے لیئے ملازمین کی ضرورت اشد تھی ۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء میں ایک دوسرا چارٹرڈ ایکٹ نافذ کرنا پڑا جس کی رو سے بورڈ آف کنٹرول کو انڈین سول سروسز کے علاوہ ملازمین کے لیئے امتحانات کے قوانین مرتب کرنے کا اختیار دیا گیا اس طرح مقابلہ کے امتحانات کا آغاز ہوا ۔

رسم و رواج :- ہر معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رسم و رواج کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور اس کی تہذیب و ثقافت، اخلاق و عادات، مذہبی عقائد اور ذہنی رجحانات اور طرز معاشرت پر ان کا گہرا اثر پڑا ہے ۔ کسی معاشرے کی ترقی یافتہ اور خوش حال یا زوال پذیر اور ہلاکت زدہ ہونے میں رسم و رواج کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں اور کسی معاشرے کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لیئے رسم و رواج کی اصلاح ناگزیر ہو جاتی ہے ۔ ہر معاشرے میں اچھی رسمیں بھی ہوتی ہیں اور بری بھی ۔ زندہ اور ترقی یافتہ معاشروں میں اچھی رسمیں زیادہ ہوتی ہیں اور بُری بہت کم ۔ لیکن اس کے برعکس مردہ اور زوال پذیر معاشروں میں بری رسمیں بکثرت سے ہوتی ہیں اور اچھی برائے نام ۔ معاشرے کی ترقی اور

اور فلاح وبہبود کے لئے یہ لازمی ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق رسم ورواج میں بھی تبدیلی کی جائے۔ بری رسمیں چھوڑی اور اچھی رسمیں اختیار کی جائیں جو معاشرہ اس اصول پر عمل نہیں کرتا اور اپنی جہالت وقدامت پرستی اور تنگ نظری کی بدولت بری رسموں پر آنکھ بند کرکے عمل پیرا رہتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کی اصلاح اور ترقی میں خود ہی رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور اپنے مستقبل کو تاریک سے تاریک تر بنا لیتا ہے۔

رسم ورواج کی نوعیت اگرچہ قانون سے مختلف ہوتی ہے لیکن لوگ ان کو بطور قانون اختیار کر لیتے ہیں۔ اور قانون سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ ان کی پابندی کرتے ہیں۔ رسم ورواج کے بارے میں لوگوں کا یہ طرز عمل روایات پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی رسم کی ابتدا کب اور کیوں کر ہوئی۔ یہ کن حالات واسباب کا نتیجہ تھی اور اس کو اختیار کرنے کے فوائد کیا تھے یہ معلوم کرنے سے نہ کسی کو دلچسپی ہوتی ہے اور نہ کوئی اس راہ سے واقف ہوتا ہے لیکن روایات کی بناء پر ہر اچھے برے رسم ورواج کو معاشرے میں جو اہمیت حاصل ہوتی ہے اُس کو سب جانتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی پابندی کرنا لازمی تصور کرتے ہیں۔ رسم ورواج کو اس قدر اہمیت دے کر ان کی پابندی کرنے کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان پر اجتماعی طور سے عمل کیا جاتا ہے۔ اور معاشرتی زندگی میں اجتماعی اثرات اتنے قوی ہوتے ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دینا افراد کے لئے تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

رسم ورواج مخصوص حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ خاص حالات میں اور خاص ضروریات کے تحت ایک کام کیا جاتا ہے اور لوگ حالات وضروریات کے مطابق مفید پاکر اس پر عمل کرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل رفتہ رفتہ اجتماعی اور پھر روایتی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بالآخر معاشرے کی اجتماعی قوت کی بدولت اس کو رسم ورواج کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مختلف ملکوں کے باشندوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں ایسی رسمیں بکثرت پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن ان رسموں کے حامی اپنی اپنی جگہ یہی سمجھتے ہیں کہ جن رسم ورواج پر وہ عمل پیرا ہیں وہی نہایت عمدہ ہیں اور برائی کا کوئی پہلو ان میں نہیں ہے۔

رسم ورواج میں تضاد صرف مختلف مذاہب کی رسومات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی رسموں میں اس سے بھی زیادہ تضاد نظر آتا ہے۔ ہندو معاشرہ ذات پات کی تفریق پر مبنی ہے لیکن اسلامی معاشرہ میں مساوات اور انسانیت کے احترام کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ہندو عرب کے غیر مسلم معاشروں میں عورت کا درجہ پست ہونے کے سبب دختر کشی اور ستی جیسی مذموم رسومات نے رواج پایا اور ان کو قابل فخر اور لائق احترام سمجھا گیا اس کے برعکس نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام مذہبی معاشروں میں ایسی انسانیت سوز رسموں کو بدترین جرم قرار دیا۔ قدیم ہندو معاشرے میں ایک عورت سے کئی کئی مردوں کے شادی کرنے کا رواج عام تھا جو اب بھی بھارت کے بعض علاقوں اور مشرق بعید کے ملکوں کے علاوہ

وسطی افریقہ کے بعض وحشی قبائل میں یہ رسم موجود ہے ۔ لیکن دنیا کی تمام مہذب قوموں میں اس رسم کو دور جہالت کی ایک قابل نفرت یادگار تصور کیا جاتا ہے ۔ مشرق کی بہت سی قوموں میں تعدد ازدواج کا رواج ہے لیکن مغربی اقوام میں اس کو نہایت بُرا سمجھا جاتا ہے اسی طرح مشرقی ممالک کے قدامت پسند طبقوں میں پردہ رائج ہے لیکن جدید تہذیب کے حامی اس کو جہالت کی علامت اور معاشرتی بُرائی تصور کرتے ہیں ، جن لوگوں میں پردے کا رواج ہے وہ پردہ کراتے ہیں اور برقعہ پوش عورتیں نقاب ڈال کر باھر نکلتی ہیں ۔ صحرائے افریقہ میں ایک قبیلے طوزخ میں مرد پردہ کرتے ہیں اور نقاب ڈال کر باہر نکلتے ہیں ۔ غرض کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف معاشروں سے تعلق رکھنے والوں میں زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی بے شمار رسمیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتی ہیں ۔

کسی ملک کی جغرافیائی کیفیت اور اسکے باشندوں کی خصوصیات کی طرح اسکے معاشی اور تہذیبی حالات بھی متعدد رسموں کو وجود میں لانے اور ان کو پھیلانے کا سبب بن جاتے ہیں ۔ معاشی اعتبار سے خوش حال لوگوں کی رسمیں شان وشوکت والی ہوتی ہیں اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے ان میں بہت سی بے جا مصرف والی رسمیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جن کا پورے معاشرے پر گہرا اثر پڑتا ہے چنانچہ سیاسی حالات سے زیادہ معاشی فراخدلی اور دولت کی فراوانی نے لونڈی غلام خریدنے کی رسم اختیار کی اور حرم رکھنے کا طریقہ رائج کیا ۔ اس کے برعکس افلاس نے

اولاد کو فروخت کردینے کی رسم کی بنیاد ڈالی ۔ معاشی حالات ھی کی بدولت رفتہ رفتہ یہ رسمیں اس قدر عام ہوئیں کہ لوگ ان کو ضرورت سمجھنے لگے ۔

معاشرے کے رسم ورواج ان کی تہذیب وتمدن اور ثقافتی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں مگر دلی کے پنجابی سوداگران کے رسم ورواج دو متضاد عظیم معاشرتی تہذیبوں کا امتزاج ہیں اور اس نومسلم معاشرے کا جائزہ لینے سے قبل ان کے سابقہ دور کے ہندو اور مسلمانوں کے معاشرتی حالات کا سمجھنا ضروری ہے کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہندو تہذیب وثقافت کے بعض رسم ورواج کا اثر دیگر لوگوں کے مانند ان میں بھی موجود ہے ۔

ہندوستان چوں کہ ہمیشہ سے ہی رسم ورواج کا دنیا بھر میں سب سے زیادہ دلدادہ رہا ہے اس لئے یہ ہندی النسل لوگ بھی ہمیشہ سے رسومات کے شائق ہیں ۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے یہ لوگ تمام رسومات بڑی شدومد سے ادا کرتے تھے جو ان کا سماج وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وضع کرتا تھا ۔ تاریخی کتابوں میں درج ہے کہ زمانہ قدیم میں شادی کا خواہش مند (لڑکا یا لڑکی) اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسلح ہو کر مطلوبہ گھرانے میں جاتا ۔ اور بزور شادی کا مطالبہ کرتا اور اسی مطالبہ کے دوران مابین فریقین میں چھڑپیں بھی ہوتی تھیں نتیجتاً مغلوب کو غالب کا مطالبہ شادی منظور کرنا پڑتا ۔ اور شادی انجام پذیر ہوتی ۔ بعد میں تبدیلی عمل میں آئی اور بالآخر موجودہ رسم یعنی لڑکی والوں سے رشتہ دینے کی درخواست کی رسم

وضع ہوئی اسی طرح مطلقہ اور بیوہ کے لئے ستی ہونے اور لذات دنیاوی سے محروم رکھنے (راہبانیہ زندگی) کی رسم رفتہ رفتہ نیست ونابود ہوئی اور عقد ثانی نے رواج پایا۔

حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد جب ان لوگوں کو اپنا معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ایک طرف ان کا خود اپنا معاشرہ اور دوسری طرف مسلم جاگیردارانہ معاشرہ سدِّ راہ ہوئے۔ تاریخ سے واضح ہے کہ عہد مغلیہ کا مسلم معاشرہ جاگیرداروں اور امیروں کا معاشرہ تھا۔ اس زمانہ کا متوسط طبقہ جو تاجروں، طبیبوں، دستکاروں کے علاوہ دیگر ارباب علم وفن پر مشتمل تھا۔ انھیں امیروں، جاگیرداروں کی ضروریات کے محور پر گھومتا اور زندگی بسر کرتا تھا۔ ان نومسلموں کے لئے نہ پائے رفتن تھی نہ جائے ماندن غرض یہ لوگ دونوں ہی سماجوں کے لئے ناموزوں تھے۔

جس طرح یہ نومسلم لوگ سماجی زندگی کے دوراہے پر کھڑے شش و پنج میں مبتلا تھے اسی طرح ان کے ہندو عزیز واقارب جو اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے اپنی رسومات میں ان لوگوں کی عدم شرکت سے اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہے تھے اور عجیب کشمکش میں مبتلا تھے۔

محروم اسلام ہندوؤں اور نومسلم لوگوں کے درمیان سماجی خلیج پاٹنے کے لئے بزرگوں (جن میں ہندو مسلم دونوں شریک تھے) نے طے کیا کہ کسی حل کی تلاش میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور دو طرفہ قابل قبول ایک

نومسلم معاشرہ تشکیل دیں۔ انھوں نے صلاح مشورے کیا اور اصلاح وترک رسومات کی تحریکات شروع ہوئیں۔ سب سے پہلے ان مصلحین نے ایسی رسومات پر نظر ڈالی جو اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف تھیں چنانچہ ان رسومات سے ان نومسلموں کو بری الزمہ قرار دیا گیا۔ پھر اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا جس میں دعوت طعام اور جہیز کا مسئلہ بطور خاص سب ہی کی توجہ کا مرکز بنا۔ واضح رہے کہ اس دور میں ہندو خاندانوں سے لڑکیاں لینے کا رواج بادشاہوں اور امیروں ہی میں نہیں بلکہ عوام میں بھی عام تھا۔ دعوت طعام کا مسئلہ تو کچھ سامان خورد ونوش اور طرز تواضع کی تبدیلی سے حل ہو گیا۔ مگر مسئلہ جہیز عقدۂ لاینحل بنا رہا۔

ہندوؤں کے قانونِ وراثت میں اولاد اناث کا کوئی حصہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ صنف باپ کی موت کے بعد بھی اس کے ترکے سے محروم رہتی تھی اس لئے ان کے سماج نے رسم جہیز وضع کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی چنانچہ ان کے یہاں جہیز محض ایک رسم ہی نہیں بلکہ دان (فریضہ) ہے جو کنیا دان کہلاتا ہے۔ ہندو سماج میں اس کی ادائیگی اپنی مرضی پر منحصر نہیں بلکہ لڑکی کے باپ کی مالی حیثیت سے ہوتی ہے کیونکہ ترکہ کا نعم البدل ہوتی ہے ہر ہندو خاندان میں دیے جانے والے جہیز کی نمائش کی جاتی ہے جس سے دینے والے خاندان کی مالی حیثیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

مسلم قانونِ وراثت میں کیوں کہ اولاد اناث کا حصہ اُولادِ ذکور سے نصف موجود ہے۔ اس لئے بیک وقت یہ رسم جہیز متروک

نہیں ہوئی بلکہ اس میں اصلاح کر کے اولاد ذکور کے نصف حصہ ترکہ کے عوض بخوشی کینا داں المعروف جہیز دینے کی رسم نے رواج پایا جو آج بھی جاری ہے۔

بلاشبہ جہیز کا رواج برصغیر ہندو پاک میں لڑکی والوں کے لئے باعث پریشانی ہے۔

ملکی سیاست اور دلی پنجابی سوداگران

دلی کے پنجابی سوداگران انڈین

کونسلز ایکٹ مجریہ ۱۸۹۲ء تک ملکی سیاست سے عملاً کنارہ کش رہے کیوں کہ انڈین کونسلز ایکٹ مجریہ ۱۸۶۱ء کے ذریعہ جو اصلاحات عمل میں آئیں ان کی رو سے گورنر جنرل کی کونسل (مجلس قانون ساز) کے لئے جو اراکین نامزد ہوتے تھے ان کو گورنر جنرل یا اس کا نمائندہ (گورنر) نامزد کرتا تھا اور قابل سے قابل اور محنتی سے محنتی مسلمان بھی ان کی نظروں میں ناقابل نامزدگی ہوتا تھا۔ اس ناانصافی کے دیگر وجوہ میں یہ وجوہ سرفہرست تھیں اولاً چوں کہ حکومت مسلمانوں سے چھینی گئی تھی۔ اس لئے فطرتاً انگریز مسلمانوں کو اور مسلمان انگریزوں کو اپنا دشمن تصور کرتے ثانیاً یہ کہ مسلمان ابنائے وطن کے مقابل انگریزی تعلیم میں کافی پیچھے تھے۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ نے ذریعہ تعلیم انگریزی کو قرار دے کر ان کی تعلیمی استطاعت پر ضرب لگائی اور پھر ۱۸۵۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے انگریزی سے عدم واقفیت کو سرکاری ملازمت اور کونسلز کی نامزدگی کے لئے سب سے بڑی نااہلی قرار دے کر سیاست میں داخلے میں رکاوٹ پیدا کردی

ایک طرف مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور ناروا سلوک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمت عملی میں شامل تھا۔ دوسری طرف اس کے ارکان کی برصغیر میں لوٹ کھسوٹ جبر واستبداد اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کی صدائے بازگشت برطانوی پارلیمنٹ میں گونج رہی تھی جس کے نتیجہ میں کمپنی کے اقتدار کو گھٹانے اور ہندوستان کو تاج برطانیہ کے تحت کرنے کا سلسلہ اگرچہ ایک صدی سے جاری تھا مگر مدبرانِ برطانیہ کسی مناسب وقت کے منتظر تھے چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی مدبران نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ برطانوی حکومت کے ہند میں قیام کا بھی اعلان کر دیا جائے، چنانچہ قانون ہند مجریہ ۱۸۵۸ء کے ذریعہ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کر کے ہندوستان کو براہ راست تاج برطانیہ کے تحت کر دیا گیا۔ جس کا اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء بمقام الہ آباد کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کا فرمان نشر کرتے ہوئے کمپنی کے خاتمے کے ساتھ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت کا اعلان کیا۔ ۱۸۶۷ء کا زمانہ برصغیر میں عام سیاسی بیداری کا زمانہ تھا۔ پہلے کانگریس اور پھر مسلم لیگ معرض وجود میں آچکی تھی۔ اگرچہ اس زمانے کے عوام کا کوئی واضح نصب العین نہ تھا تاہم ہندوستان کی آبادی میں اپنے حقوق کے تحفظ کا شعور دوسروں کی طرح ان میں بھی پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ منٹو مارلے اصلاحات مجریہ ۱۹۰۹ء سے فیضیاب ہونے کے لئے برادری کے کچھ بزرگوں نے برادری کو قوم کا درجہ دے کر اس کے لئے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جبکہ

Bahi 66

THE ANJUMAN WAKIL-I-QOUM (PUNJABIAN) DELHI

No.

Katra Harsa.

Delhi. 2 august 1909. 190

To

The Registrar

Joint Stock Companies,

LAHORE.

Sir,

We the undersigned have the honour to inform you that we have formed ourselves into a society called Anjuman Wakil-i-Qoum Panjabian for the literary and charitable purposes specified in the Memorandum attached herewith. We have also opened a Commercial School in connection with the Anjuman up to the Middle Standard.

The usual fee of fifty rupees is sent by Money Order.

Hoping you will be kind enough to register this society under Act XXI of 1860.

We have the honour,

Sir,

to be your obedient servant.

(1) Mirza Abdul Razaq ——— [signature]
(2) Mohd Ayoob Kanker ———
(3) Mohd Siddiq Chandna ——— [signature]
(4) Mohd Siddiq Pani Wala ———
(5) Mohd Siddiq Mullan Wala ——— Mohamed Siddiq
(6) Abdul Salam ——— [signature]
(7) Mohd Usman ——— [signature]

انجمن وکیل قوم پنجابیان (دہلی) کی تاسیس کے بعد ادارہ کی رجسٹریشن کے لئے دی جانے والی درخواست کا عکس جس پر متعدد رہنمایان برادری کے ہیں و موثر دستخط ثبت ہیں

محمد عمر

نام "انجمن وکیل قوم پنجابیاں" رکھا۔

منٹو مارلے اصلاحات کی دفعات کے ذریعہ ایسے مستند اداروں کو جو تجارت کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے میونسپل کمیٹی (بلدیات) اور گورنر جنرل کی انتظامی مشاورتی کونسلوں کے لئے اپنے نمائندگان منتخب کرنے کا اختیار تفویض کیا گیا تھا اس لئے انھوں نے بھی انجمن وکیل قوم پنجابیان کو ایک مستند ادارہ بنائے جانے کی درخواست بنام رجسٹرار جوائنٹ اسٹاک کمپنیز کے دفتر واقع لاہور میں مورخہ ۲، اگست ۱۹۰۹ء کو گذاری جو ۱۸ فروری ۱۹۱۰ء کو قبول و منظور ہوئی اور اس کی سند عطا ہوئی۔ اس طرح انجمن وکیل قوم پنجابیان ایک مستند تجارتی ادارہ یا ایوان ہائے تجارت بن گیا سند کی کاپی درج ذیل ہے۔

منٹو مارلے اصلاحات کی رو سے سرکاری اور نیم سرکاری محکمہ جات (جن میں بلدیات، ٹاؤن ہال بھی شامل ہیں) کے ارکان کی دو قسمیں تھیں۔

(۱) منتخبہ (۲) نامزد شدہ۔ اول الذکر منتخبہ قسم کے ارکان کو منتخب کرنے کا حق عوام کے ساتھ ان کے مستند اداروں، یونیورسٹیوں، ایوانہائے صنعت اور ایوانہائے تجارت کو حاصل تھا اور نامزد اراکین کو گورنر جنرل یا اس کا نمائندہ نامزد کرتا تھا۔ چنانچہ دہلی میونسپل کمیٹی کے مسلم نمائندگان میں ایک نمائندہ انجمن وکیل قوم پنجابیان کا بھی ہوتا تھا دہلی میونسپل کمیٹی کی یہ ہیئت ترکیبی قیام پاکستان تک جاری رہی اور ہر انتخاب میں انجمن کا منتخب شدہ ایک نمائندہ اس کی نمائندگی کیلئے شامل ہوتا رہا۔

تیسرا باب

(۱۴) دہلی کے خاص خاص بازار، عمارتیں اور تاریخی مقامات

دہلی میں آباد قدیم پنجابیوں کے محلوں، دکانوں اور مکانوں کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس لئے کچھ خاص خاص مقامات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ترقی یافتہ دہلی یا شاہجہاں آباد کو بھوجلا اور جھوجلا نامی دو پہاڑیوں کو کاٹ کر ان پر تعمیر کیا گیا تھا۔ بھوجلا پہاڑی شہر کے وسط میں شرقاً و غرباً پھیلی ہوئی تھی اور جھوجلا پہاڑی شمال مغرب میں واقع تھی۔ شاہجہاں آباد میں تین عالی شان بازار تعمیر کئے گئے تھے اور ان کے مختلف تھے مختلف ناموں سے موسوم تھے

(۱) خاص بازار
(۲) فیض بازار
(۳) چاندنی چوک

خاص بازار :- یہ بازار جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان شمالاً جنوباً واقع تھا مگر برنیر نے اپنے خط میں جو اس نے دہلی سے اپنے وطن لکھا تھا اس بازار کو شاہی چوک سے تعبیر کیا ہے وہ قلعہ کے لاہوری دروازہ سے ملحق باغ کے متعلق لکھتا ہے۔" یہ بارہ مہینے ہرے بھرے پودوں اور پھلوں سے سرسبز رہتا ہے۔ باغ سے ملا ہوا چوک شاہی ہے جس کا ایک رُخ تو قلعہ کے دروازے کی طرف ہے اور دوسرا دو بازاروں کی طرف ختم ہوتا ہے اسی چوک احاطہ میں ان امراء کے خیمے لگے رہتے ہیں جن کی نشست کی باری ہر ہفتہ آتی ہے۔ اسی میدان میں خاصے کا بڑا افسران گھوڑوں کا معائنہ کرتا ہے جو فوج میں بھرتی کئے جاتے ہیں۔ یہیں ایک بہت بڑا بازار (خاص بازار) ہے جس میں ہر قسم کی اشیاء ملتی ہیں جیسے پیرس میں پانٹ نوف (Pont Neuf)۔ یہ جگہ تماشائیوں اور سیلانیوں کی سیر گاہ ہے۔ یہیں ہندو اور مسلمان رمال و نجومی جمع رہتے ہیں۔"

فیض بازار :- شمالی سمت شہر کے دہلی دروازے سے قلعہ کے دہلی دروازے تک پھیلا ہوا یہ پُر رونق بازار ہی فیض بازار کہلاتا ہے۔

چاندنی چوک :- قلعہ کے لاہوری دروازہ سے شہر کے لاہوری دروازہ تک پھیلا ہوا پُر رونق عالی شان بازار کا نام چاندنی چوک ہے۔ یہ بازار پندرہ سو بیس گز لمبا اور چالیس گز چوڑا ہے اس کے بیچوں بیچ "علی مردان" کی نہر بہتی تھی۔ اس کے

مشرقی سرے پر قلعہ کا لاہوری دروازہ اور دوسرے سرے پر
مسجد فتح پوری ہے اس کا وہ حصہ جو قلعہ کے لاہوری دروازے اور
دریبہ کے خونی دروازے کے درمیان واقع ہے۔ اردو بازار
کہلاتا ہے۔

بیرون دہلی

دلی شہر کے لاہوری دروازے کے باہر مغربی
سمت ایک سیدھی سڑک ریلوے اور نہر کے
پل کو عبور کرتی اور باڑہ ہندو راؤ کو چھوتی ہوتی سیدھی سرائے
روح اللہ خان کو جاتی ہے۔ سرائے روح اللہ خان کا ہی ریلوے
اسٹیشن کبھی پنجابی سرائے کہلاتا تھا۔ اسی کے آس پاس وہ پنجابی
کٹرہ واقع تھا جس کو قدیم پنجابی سوداگران کے آباؤ اجداد نے پنجاب سے
ترک مکانی کے بعد اپنی اولین اقامت گاہ کے طور پر پسند کیا تھا۔ داہنے
ہاتھ کی طرف ہندو راؤ کے پارے ہو کر بنگش کے پل سے گذرتے
ہوئے سبزی منڈی کی بڑی سڑک (جرنیلی سڑک یا شاہ راہ اعظم)
سے جا ملتی ہے۔ یہ ہی وہ پندرہ سو میل لمبی سڑک ہے جو دہلی
کو شمال میں پشاور سے جنوب میں سونار گاؤں یا کلکتہ سے ملاتی ہے
لاہوری دروازہ کی سمت ریلوے اور نہر کا پل اتر کر صدر بازار ہے
جو حال کا بسا ہوا ہے۔ یہاں قدیم پنجابی سوداگران کی ہول سیل کی دکانیں
دو طرفہ ہیں۔ صدر بازار جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں ایک ہی
سڑک ہے البتہ اس سے پہلے

ایک چوراہا ہے جسے عوام قطب روڈ کہتے ہیں کیوں کہ اس چوراہے سے
ایک سڑک شمال میں سبزی منڈی اور جنوب میں درگاہ حضرت خواجہ

باقی باللہ سے داہنے ہاتھ کو پہاڑ گنج کی بستی کو چھوڑتی ہوئی مہرولی یا
قطب صاحب چلی گئی ہے اسی قطب روڈ کے صدر سے ملحق حصہ
پر پنجابی اسکول ہے جس میں قدیم پنجابی سوداگران کے لڑکے پڑھتے ہیں اور
اس میں پنجابی ہنری سکھانے کا خاص اہتمام ہے۔

صدر بازار کے آخر میں چوراہا ہے جو بارہ ٹوٹی کہلاتا ہے
یہاں پہلے نل کی بارہ ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس چوراہے پر ایک
تو وہی سڑک ہے جو لاہوری دروازے سے آرہی ہے اور باڑہ
ہندو راؤ سے ہوتی ہوئی سرائے روح اللہ خاں پر ختم ہوتی ہے۔
دوسری شمالاً جنوباً ہے۔ شمال میں بہادر گڑھ روڈ کو ملا کر ختم ہوجاتی
ہے۔ اس پر چمڑے کے گودام ہیں۔ بہادر گڑھ روڈ پر ایک سمت
تیلی واڑہ اور دوسری سمت شیش محل، کشن گنج اور فیل خانہ کے
علاوہ گاموں کی مسجد ممن جمعدار کی گلی بھوجی کی گلی واقع ہے۔

باڑہ ہندو راؤ اور پل بنگش کو سڑک اعظم یعنی سبزی منڈی
والی سڑک سے ملانے والی سڑک جو شمال میں شاہ راہ اعظم کے اتصال
پر ختم ہو جاتی ہے مغرب کی جانب عیدگاہ قبرستان شیدی پورہ کو
چھوڑتی ہوئی بھوری بھٹاری کے محل تک چلی گئی ہے۔ اس سڑک
کے درمیان میں بہت سے گنجان محلے آباد ہیں جن میں

(۱) باغیچی اچھے جی (۲) بکی گلی
(۳) کوٹھی چوہیا میم (۴) گلی بیت والی
(۵) باغیچی البشری پرشاد (۶) ٹھیلے والی گلی
(۷) محلہ شیخان (۸) بیرلون والا باغ

(۹) ارنڈیوں والا باغ (۱۰) نواب والا باغ

بہت مشہور ہیں ماسوائے باغیچی اچھے جی جو خالصتاً قدیم پنجابی سوداگران یا دلی پنجابی سوداگران کی بستی ہے باقی تمام محلّوں میں ان کی آبادی مشترک ہے ۔

بیرون شہر دلی جانب جنوب مغرب

(۱) **قبرستان شیدی پورہ** ۔ باڑہ ہندو راؤ کے پورا ہے سے جنوبی سمت نئی عیدگاہ کے نزدیک شیدی پورہ کی آبادی ہے ۔ یہاں چونے کی بھٹیاں ہیں اور ایک قبرستان ہے جس کو قبرستان شیدی پورہ کہتے ہیں یہاں قدیم پنجاب سے ترک وطن کرکے آنے والے دلی کے پنجابیوں کی قبریں ہیں ۔ اس میں ایک خاص مزار جناب شمس العلماء مولانا میاں نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے اگرچہ مولوی صاحب دلی کے پنجابیوں میں سے نہ تھے مگر کچھ عقیدت مندوں نے ان کو اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ دفن کرنا مناسب خیال کیا ۔

(۲) **پہاڑ گنج** :۔ یہ دہلی کے مضافات میں ایک بستی ہے شاہی زمانہ میں جب دلی کی آبادی اور پھیلاؤ کا ٹھکانہ نہ رہا تو ضرورت کے تحت بیرون فصیل شہر بھی جہاں سر چھپانے کو جگہ ملی مکانات بنائیے گو پہاڑ گنج اب ایک جداگانہ محلے کی حیثیت سے رکھتا ہے مگر وہ پہلے دلی کا ایک محلہ تھا ۔

(۳) **پرانی عیدگاہ** حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے پاس پرانی عیدگاہ واقع ہے ۔ یہ عمارت اپنے طرزِ تعمیر سے عالی شان ہے ویسی ہی قدیم بھی ہے چونکہ اس پر کوئی کتبہ نہیں ہے ۔ اس لئے اس کا سن تعمیر معلوم نہ ہوسکا تاہم اندازہ ہے کہ دورِ مغلیہ سے پہلے کی تعمیر کردہ ہے فی الوقت وہ ایک سرائے میں تبدیل ہوگئی ہے جس میں کثرت سے بھٹیار خانے ہیں ۔ انگریزوں نے جنگ آزادی کے بعد اس پر سرکاری قبضہ کرکے نیلام کیا تو قدیم پنجاب سے آئے ہوئے دلی کے پنجابیوں میں سے ایک شخص جناب شیخ خلیل الرحمن صاحب نے اس کو خرید لیا اور اس کے کرائے کی آمدنی سے وہ متمتع ہوتے ہیں اس میں واقع مسجد اپنی اصلی حالت پر قائم ہے اور اکثر و بیشتر اس کی مرمت کرائی جاتی ہے ۔

(۴) **نئی عیدگاہ** پرانی عیدگاہ سے آگے بڑھ کر ایک ٹیلہ پر نئی عیدگاہ بنی ہوئی ہے اور اب اس میں عیدین کی نماز ہوتی ہے یہ عیدگاہ عالمگیر بادشاہ کی بنوائی ہوئی ہے ۔ اس کا صحن ۵۵۰ فٹ مربع ہے جس میں سے ۴۰۰ فٹ مربع تو (قدیم پنجاب) دلی کے پنجابیوں میں سے ایک صاحبِ خیر نے پختہ کروایا ہے اس میں ۱۴۰ صف ہیں اور ہر صف میں پانچ سو نمازیوں کی گنجائش ہے

(۵) **درگاہ سید حسن رسول نما** یہ درگاہ پہاڑ گنج سے تقریباً دو فرلانگ پر واقع ہے ۔ صاحب مزار سید حسن جو اولیائے کبار میں سے تھے ۔ آپ کا لقب رسول نما اس سبب سے ہوا کہ آپ کو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں ایسا تقرب تھا

کہ آپ جس کو چاہتے سرورِ کائنات کی زیارت سے مشرف کرا دیتے تھے۔ سنہ ۱۷۳ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

منڈی :- شیر شاہ سوری کے دور میں پورے ملک میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا تھا اور پندرہ سو میل لمبی جرنیلی سڑک پر دو رویہ باغات اور شحنہ سرائے بنوائی گئیں جس کے سبب شمال میں پشاور سے جنوب میں سونار گاؤں (کلکتہ) تک بری راستے پُر امن اور محفوظ ہو گئے۔ ماہرینِ تجارت میں سے ایک شخص نے جس کا نام تاریخ میں مہربان آغا بیان کیا گیا ہے اور جس کے متعلق واضح الفاظ میں تاریخ یہ شہادت دیتی ہے کہ وہ شہنشاہ جہانگیر کا معتمد خاص تھا، دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے مضافات دہلی کے اس حصہ میں جو جرنیلی سڑک (شاہراہ اعظم) کے وسط میں واقع ہے پالم پور (ہوائی اڈہ دہلی) سے جانب جنوب نزد مغل پورہ ایک تجارتی بستی بنام منڈی آباد کی۔ اسی منڈی کے اس حصہ میں جو اب بھی سرائے روح اللہ خاں کہلاتا ہے اور کبھی پنجابی سرائے کے نام سے معروف تھا۔ آس پاس (قدیم) دلی کے پنجابی سوداگراں کے دو محلے تھے (۱) بستی کلاں پنجابیاں (۲) (۲) بستی خورد

بستی کلاں میں پنجابیاں کے آثار باقیہ آج بھی موجود ہیں۔ بستی خورد جو کسی زمانہ میں پنجابی کٹرہ کہلاتی تھی اور سرے پر واقع پنجابیوں کی مسجد کے در و دیوار پر قصہ پارینہ سنانے کے لئے موجود ہیں دراصل منڈی ایک ایسا بازار ہے جہاں خرید و فروخت کے لئے مال ہر وقت موجود ہو اور کٹرہ اس آبادی کو کہتے ہیں ایک ہی مسلک

میوٹینی موریل یادگار غدر فتح گڈھ منارہ

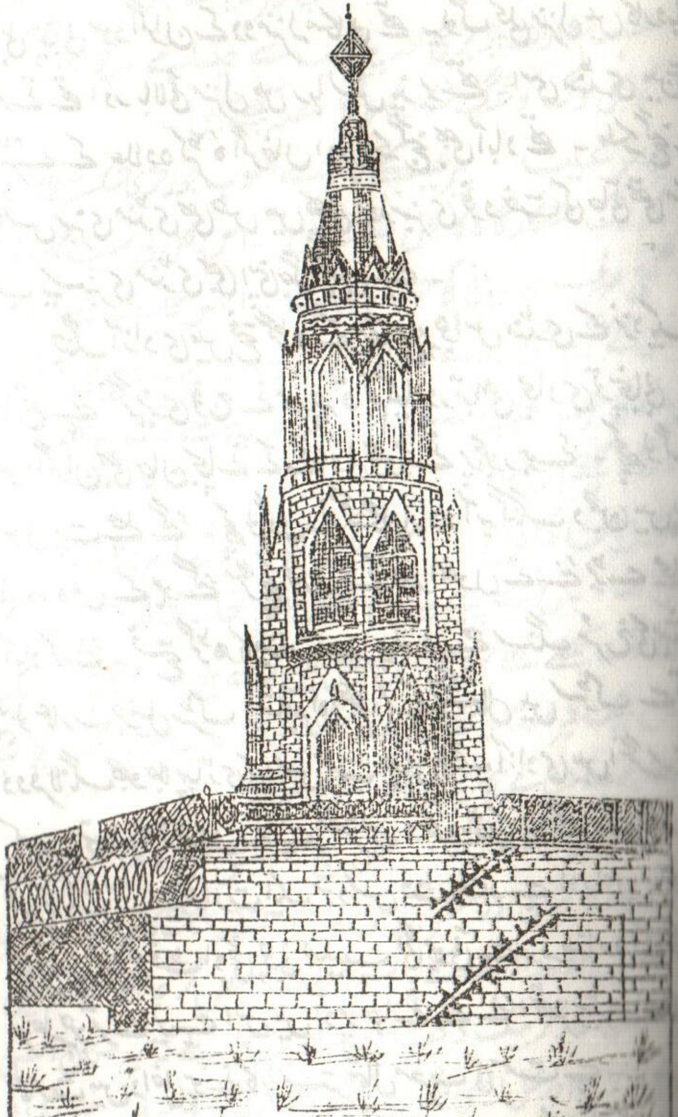

مشبرب کے لوگ آباد ہوں اس کٹڑہ اور بستی کلاں میں دو رویہ قدیم دہلی پنجابی سوداگران کے دومنزلہ مکان تھے یہ لوگ نچلی منزل میں کاروبار کرتے تھے اور بالائی منزل میں رہائش پذیر تھے ۔ اسی منڈی میں پنجابی کٹڑے کے علاوہ کٹڑہ اگرخاں اور ملکہ گنج بھی آباد تھے ۔ ملکہ گنج کے پاس سبزی منڈی تھی جس میں پھل اور سبزی فروخت کی جاتی تھی مگر اب یہ سبزی منڈی بھی اپنی جگہ نہیں ہے ۔

جنگ آزادی میں فتح گڑھ کے مقام پر جو اس منڈی کے نزدیک واقع ہے انگریزی فوج نے مورچہ قائم کیا اور تباہی مچادی تو پنجابی سوداگران بھی جان بچانے کے لئے دلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے ۔ کچھ لوگ سونی پت چلے گئے ۔ کچھ لوگوں نے گنگا پار دو آبہ گنگ دمن میں پناہ لی اور وہیں کے ہو گئے مگر کچھ لوٹ آئے اور انھوں نے نئے بڑے محلے آباد کر لئے ۔

فتح گڑھ کا مینار — چار درجے سنگ سرخ کی ہشت پہلو عمارت جرنیل سڑک (شاہراہ اعظم) کے شمال میں سڑک سے تقریباً دو فرلانگ جھوجلا پہاڑی کی اس سمت جہاں جنگ آزادی میں انگریزی کیمپ تھا ۔ انگریزوں نے اپنے مقتولین و مجروحین کی یادگار کے طور پر تعمیر کرائی تھی ۔ یہ عمارت ایک سو دس فٹ بلند ہے اور اس پر اوپر کی جانب پانچ فٹ اونچی چوبی صلیب لگی ہوئی ہے ۔ یہ مینارہ ایک سہ مرحلہ چبوترے پر ہے اس میں اوپر جانے کے لئے اٹھتر سیڑھیاں ہیں عمارت میں داخل ہونے کا راستہ شمال مغرب کی سمت ہے ۔

کوشک شکار یا جہاں نما اس عمارت کو ۱۳۵۴ء میں فیروز شاہ تغلق نے اپنے آباد کردہ شہر تغلق آباد کے باہر موجودہ شہر

کے جانب شمال شکارگاہ کے طور پر تعمیر کرایا تھا جس کا پتہ دو نصف منہدم عمارات چوبرجی اور پیر غیب سے چلتا ہے ۔ چوبرجی کی عمارت کو بھی لوگ کوشک شکارگاہ کا حصہ سمجھتے ہیں ۔

پیر غیب پیر غیب کے نام سے منسوب جو اجڑی شکستہ عمارت ہے اس کو لوگ شکارگاہ کا محل بتلاتے ہیں ۔ اس محل کی سب عمارت تو گر گئی صرف درمیانی کچھ حصہ باقی ہے ۔ اس عمارت کے آثار باقیہ اس کے عظیم و وسیع ہونے کے گواہ ہیں ۔ یہاں زینہ سے ملی ہوئی سیدھے ہاتھ کی طرف اونچے چبوترے پر ایک پختہ قبر ہے جسے لوگ پیر غیب کی درگاہ کہتے ہیں ۔

شیر جن کا باغ سول لائن میں باونڈ کے قریب شیر جن نامی باغ تھا ، باغ سے پہلے یہ تمام علاقہ جنگل تھا ۔ گلدار چیتے آتے تھے لوگ سمجھتے تھے شیر بھی اس جنگل میں رہتے ہیں ۔ ۱۹۱۵ء تک یہاں ایک قبرستان تھا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قدیم پنجاب سے آئے ہوئے دلی کے پنجابیوں کا قبرستان تھا ۔

ہندو راؤ کا باڑہ کشن گنج ، شیش محل ، فیل خانہ ، ہندو راؤ کا مکان اور مسٹر ولیم فریزر (جو ۱۸۳۰ء تک دلی کا ریزیڈنٹ رہا اور کشمیری دروازے کے پاس سینٹ جیمس گرجا کے احاطہ میں دفن ہے) کا ذکر بیک وقت اس لئے لازمی ہے کہ یہ مکان اسی لحاظ موقع اور محل ایسی جگہ بنایا تھا کہ سارا شہر یہاں سے دکھائی دیتا تھا اور کسی بھی رخ ہوا چلتی یہاں ضرور پہنچتی تھی ۔ فریزر کے مرنے کے بعد یہ مکان ہندو راؤ نے خرید لیا ۔ ہندو راؤ کے باڑے کے تیں

احاطے تھے ۔ باڑے کے معنی محلے کے ہیں ورنہ ہندوراؤ کے مکان سے متعلق تو بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک مکان تھا ۔ اور ان تینوں احاطوں میں ایک ، باغ تھا دوسرا فیل خانہ تیسرا شیش محل ۔ شیش کے متصل ایک احاطہ مثل سرائے یا اصطبل کے تھا ۔ یہ سب مہاراجہ ہندوراؤ نے اپنے دیوان کشن چند کو عطا کر دیا تھا ۔ اس جگہ کا نام اب کشن گنج ہے ۔ جس طرح کشن گنج اب ایک محلہ ہے ۔ اسی طرح شیش محل بھی اب محل نہیں بلکہ ایک محلہ ہے اور یہاں قدیم پنجاب سے آئے ہوئے دلی کے پنجابی آباد ہیں ۔ جس احاطہ میں باغ تھا ۔ اس کے محاذ میں افتادہ اراضی اور منہدمہ مکانات تھے وہ جگہ اب ہندوراؤ کے باڑے باغچی الیشری پرشاد بیت والی گلی ، پکی گلی اور باغچی اچھے جی کے ناموں سے مشہور ہے ۔

شاہ جی کا تالاب اجمیری دروازے کے باہر لب سڑک یہ بہت بڑا وسیع تالاب ہے مگر اب مٹی سے اٹ گیا ہے ۔ تالاب کے گرد نفیس اور عمدہ گھاٹ بنے ہوئے ہیں ۔ تالاب ہشت پہلو ہے ۔ شاہ جی کا اصل نام نواب شادی خان تھا جو بلخ کے رہنے والے تھے ۔ شاہ عالم ثانی (ف ۱۸۰۶ء) کے وقت وارد ہند ہوئے ۔ یہ تالاب انھیں کا بنوایا ہوا ہے ۔

قدم شریف یہ مقبرہ فتح خان بھی کہلاتا ہے ۔ لاہوری دروازے کے جنوب فصیل شہر سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر یہ درگاہ بہت نامی گرامی ہے یہ درحقیقت شہزادہ فتح خان کی قبر ہے اور اس پر نقش قدم جناب رسالت مآبؐ لگا ہوا ہے ۔ ۱۳۷۴ھ میں جب

شاہزادہ فتح خان کا انتقال ہوا تو سلطان فیروز تغلق نے جو شہزادہ کو بہت چاہتا تھا یہ مقبرہ بنوایا اور یہ قدم اس پر لگوا دیا ۔

چونسٹھ کھمبا یہ ایک عالی شان مستحکم عمارت عہد اقاغنہ کی تعمیر کردہ ہے اس عمارت کے محاذ بجانب مشرق دوہرا دالان پانچ دروں کا ہے جس کے دس در ہوئے ۔ شمال اور جنوب دالانوں میں تین تین در ہیں یعنی چھ دالانوں کے چھ در ہوئے اس طرح جملہ سولہ در ہوئے اس طرح چار چار در کا ایک مربع حصہ ہو کر اس کے چونسٹھ ستون ہوئے ان چونسٹھ ستونوں کی نسبت سے یہ عمارت چونسٹھ کھمبا کہلاتی ہے ۔

درگاہ شاہ ولی اللہ :- اس درگاہ کا احاطہ پختہ ہے جس کے اندر ایک مسجد ہے ۔ مسجد کے جنوب میں چبوترے پر سنگی جال دار کٹہرے کے اندر حضرت شاہ عبدالرحیمؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت حضرت شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالغنی حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے خاندان اور دوسرے حضرات کی قبریں ہیں ۔ سب سے پہلے ہندوستان میں حضرت مفتی شمس الدین فاروقی تشریف لائے اور ... میں مقیم ہوئے ۔ شاہجہاں کے زمانہ میں مفتی صاحب کی اولاد میں سے مولانا شیخ وجیہہ الدین دہلی تشریف لائے اور اسی جگہ رہے جہاں آسودۂ خواب ہیں ۔ اس وقت یہ مقام شہر کے اندر ... ہوتا تھا ۔ چنانچہ اب تک بھی مکانوں اور مسجدوں کے کھنڈرات دکھائی دیتے ہیں ۔

اگرچہ بیرون دہلی کی متذکرہ عمارات اور مقامات کے علاوہ

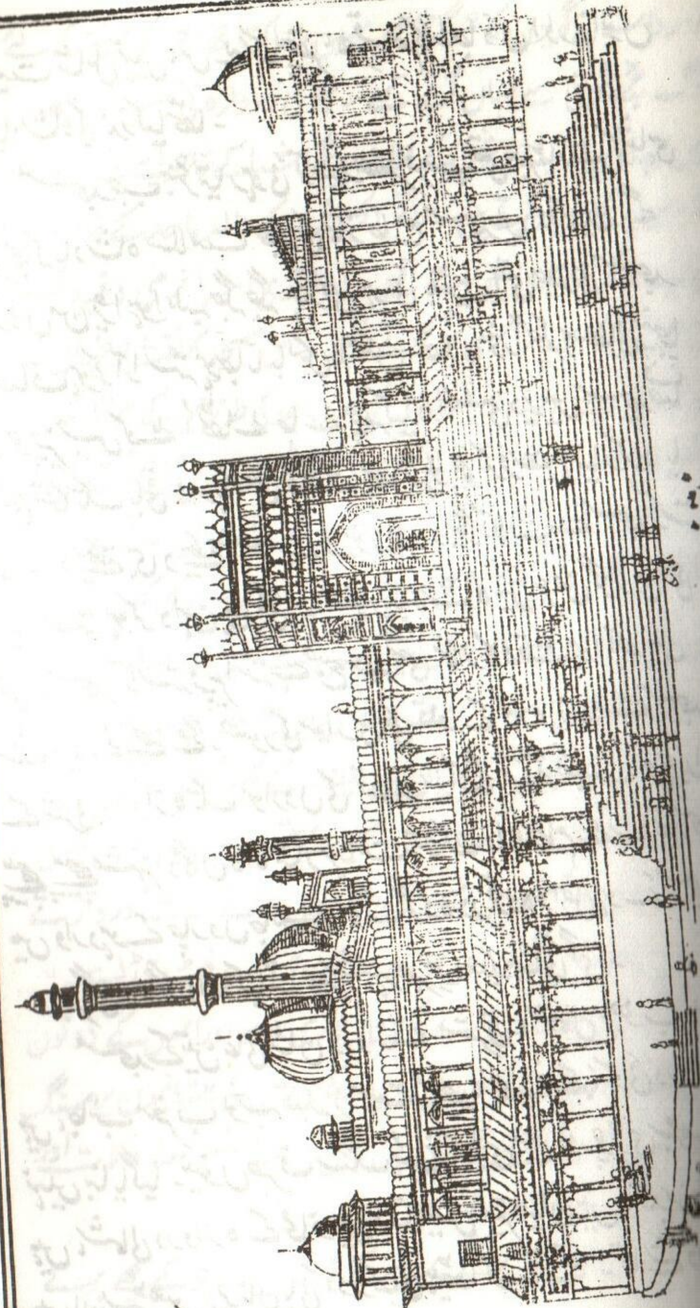

اور بہت سے مقامات قابل دید اور لائق تعریف ہیں اور جن کی تاریخی اہمیت بھی کچھ کم نہیں لیکن طوالت کے خوف سے صرف ان مقامات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے کسی نہ کسی طرح دلی کے پنجابیوں کا تعلق رہا ہے

اندرونِ شہر دہلی :-

جامع مسجد دھلی :- اس کو شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۶۴۸ء میں بنوایا تھا یہ سارے ہندوستان کی تمام مسجدوں سے بڑی اور سب سے عمدہ ہے ۔ ہندوستانی روایت کی رو سے اس عالی شان عمارت کی بنا ۱۸ ارشول المکرم ۱۰۳۰ھ یا اکتوبر ۱۶۵۰ء میں ڈالی گئی ۔ جامع مسجد لال قلعہ سے کوئی ہزار گز کے فاصلہ پر ہے ۔ بھوجلا پہاڑی پر خاص بازار کے مغربی کنارے پر بنی ہوئی ہے ۔ اس کی کرسی جو سنگ سرخ کا ایک بڑا بھاری چبوترہ ہے ۔ سطح زمین سے تیس فٹ بلند اور چودہ سو مربع گز ہے اس کی تعمیر زیر انتظام سعد اللہ خان وزیر اور فضل خاں خانساماں ہوئی ۔ مشہور ہے کہ جب مسجد کی بنیاد رکھنے کا وقت آیا تو بادشاہ ظل اللہ نے فرمایا کہ اس کی بنیاد وہ شخص رکھے جس کی نماز تہجد اور تکبیر اولیٰ کبھی قضا نہ ہوئی ہو ۔ یہ سن کر سب نے گردنیں جھکا لیں اور کچھ جواب نہ دیا ۔ جب بہت دیر ہو گئی تو بادشاہ نے فرمایا " الحمد للہ مجھ میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں مگر افسوس کہ آج یہ راز فاش ہوتا ہے " اور پھر اپنے دست مبارک سے سنگِ بنیاد رکھا ۔ بیان کیا گیا ہے کہ چھ ہزار راج بیلدار مزدور اور سنگ تراش چھ برس تک روزانہ اس کی تعمیر میں لگے رہے ۔ دس لاکھ روپیہ خرچ ہوا جس میں پتھر

کی قیمت شامل نہیں اس لئے کہ پتھر، ہر قسم کا راجاؤں اور نوابوں نے بادشاہ کی نذر کیا تھا۔

مسجد جب بنکر تیار ہوئی تو عید الفطر قریب تھی میر عمارت کو شاہی حکم پہنچا کہ بادشاہ سلامت عید کی نماز جامع مسجد میں ادا کریں گے ہزاروں من پڑا ہوا ملبہ جگہ جگہ بندھی ہوئی باڑیں اتنی جلدی مسجد کا صاف ہو کر آراستہ ہو جانا بالکل ناممکن تھا۔ فوراً حکم سلطانی پہنچا کہ جو چیز جس کو ملے اُٹھالے جائے پھر کیا ذرا سی دیر میں مسجد صاف ہو گئی تنکا تک باقی نہ رہا اسی وقت جھاڑ پونچھ کر فرش تیار کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شیشہ و بلور اور دیگر آلات سے مسجد آراستہ و پیراستہ ہو کر دلہن بن گئی۔ حضور بادشاہ میں عرض گزاری کی گئی کہ مسجد آراستہ و پیراستہ ہے صبح عید تھی نماز کا وقت ہوا قلعہ میں شادیانے بجنے لگے۔ حضور کی سواری نکلی قلعہ کے دروازے سے مسجد کے شرقی دروازہ تک سواروں کی قطار، آگے آگے نقیب و چوبدار پیچھے پیچھے شہزادگان والا تبار نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مسجد میں وارد ہوئے چاروں جانب سے لوگ گروہ در گروہ داخل ہوئے مسجد بھر گئی دوگانہ ادا کیا گیا پھر شہر بھر میں عید منائی گئی۔

مسجد کے تین عالی شان دروازے مشرق، شمال، جنوب میں ہیں، جانب مغرب بوجہ قبلہ (سمت سجدہ ہونے کے) کوئی دروازہ نہیں بنایا گیا۔ تینوں طرف سنگ سُرخ کی لمبی لمبی اور چوڑی سیڑھیاں ہیں، شمالی دروازہ کے محاذ میں انتالیس سیڑھیاں ہیں۔ قدیم زمانے میں ان سیڑھیوں پر نان بائی اور کبابی بیٹھا کرتے تھے۔ تماشے والوں

اور داستان گویوں کا جمگھٹا بھی یہیں رہا کرتا تھا جن کو سننے کے لئے لوگ بڑے شوق سے یہاں آتے تھے۔ جنوبی دروازہ کی تینتیس سیڑھیاں ہیں جہاں پارچہ فروشوں کے علاوہ دیگر اشیا کے تاجر اپنے اپنے فرش بچھا کر اس پر کاروبار کرتے ہیں۔ راقم الحروف کے والد ماجد کے خالو جو قدیم پنجاب کے پنجابیوں میں سے تھے۔ ادھوڑی استرا نرمی وغیرہ قسم کے جوتوں کا بیوپار اسی جگہ کرتے تھے۔ اس مسجد کا نقشہ جو جہاں نما بھی کہلاتی ہے عرب اور قسطنطنیہ کی مساجد کی طرز تعمیر کے مماثل تیار کیا گیا ہے اس مسجد کی لمبائی دو سو اکسٹھ فیٹ اور چوڑائی نوّے فٹ ہے۔ مسجد کے تین کمرک نما گنبد ہیں جن پر ایک ایک پٹی سنگ موسیٰ اور ایک سنگ سرخ کی پڑی ہوئی ہے اور ان پر سنہری کلس ہے۔ یہ گنبد طول میں نوّے فٹ اور عرض میں تیس فٹ ہیں اور میناروں کی بلندی ایک سو تیس ۱۳۰ فٹ ہے ان میں چکر دار زینہ ہے جس میں اوپر کی سمت ایک سو تیس سیڑھیاں ہیں مینار کے تین کھنڈ (حصے) ہیں ہر کھنڈ کے گرد کھلا ہوا برآمدہ ہے۔ مسجد کے عقب میں چار چھوٹی چھوٹی برجی دار مینار ہیں مسجد میں بڑی بڑی محرابوں والے سات دروازے ایک پیش دلان میں گیارہ در ہیں ہر دالان چوبیس فٹ چوڑا ہے۔ ان میں بیچ کی محراب ایک دروازے کی طرح چوڑی ہے اور اس کے دونوں جانب ہشت پہلو برجیاں ہیں۔ ان کے دروں کی پیشانیوں پر سنگ موسلی سے بنی ہوئی تختیاں چپاں ہیں۔ جن پر تعمیر مسجد کے حالات اور شاہجہاں کے برکات کندہ ہیں۔

مسجد کے صحن میں سنگ سرخ کے بڑے بڑے چوکے بچھے ہوئے

ہیں جن کی وسعت ایک سو چھتیس گز مربع ہے باوجود اس وسعت کے اس کا ڈھلاؤ اس خوبی سے رکھا ہوا ہے کہ ادھر مینہ برسا (بارش ہوئی) ادھر صاف کیا مجال کہ ایک قطرہ پانی کا کھڑا رہ جائے دوسری ندرت اس مسجد میں یہ ہے کہ ساری مسجد میں کبوتر و ابابیل کا نام نہیں ورنہ دلی کی فتح پوری مسجد اور حیدر آباد دکن کی مکہ مسجد میں کبوتروں کے لئے جال لگانے پڑے ہیں تب کہیں جا کر امن ملتا ہے

(مسجد اکبر آبادی) :- تقسیم ہند سے قبل تک جامع مسجد کے محاذی ایک نہایت فرحت بخش تفریح گاہ تھی جس کا نام ایڈورڈ پارک تھا اس پارک کا سنگ بنیاد شاہ برطانیہ جارج پنجم نے خود اپنے ہاتھ سے رکھا تھا۔ اور مختلف دھاتوں سے بنایا ہوا۔ آنجہانی ایڈورڈ ہفتم کا ایک مجسمہ بھی یہاں نصب تھا۔ بدین وجہ یہ ایڈورڈ پارک مشہور تھا۔

یہی موقع و محل مسجد اکبر آبادی کا ہے۔ جس وقت اس پارک کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو اس مسجد کا چبوترہ اور صحن جوں کے توں ڈھک دیئے گئے۔ اس طرح یہ بے نظیر عمارت ہمیشہ کے لئے نظروں سے پوشیدہ ہوگئی۔

نقشہ اس کا ملاحظہ فرمایئے اور ساتھ ہی کیفیت اس کی صاحب آثار الصنادید - سر سید احمد خان سے سنئے

یہ ایک مسجد ہے۔ دل کش اور دل ربا ہے۔ فرحت بخش ارواح پر در سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی اور اس کے مکانات اور حجرے طالب علموں کے رہنے کے لئے بنے ہوئے ہیں۔ ضلع

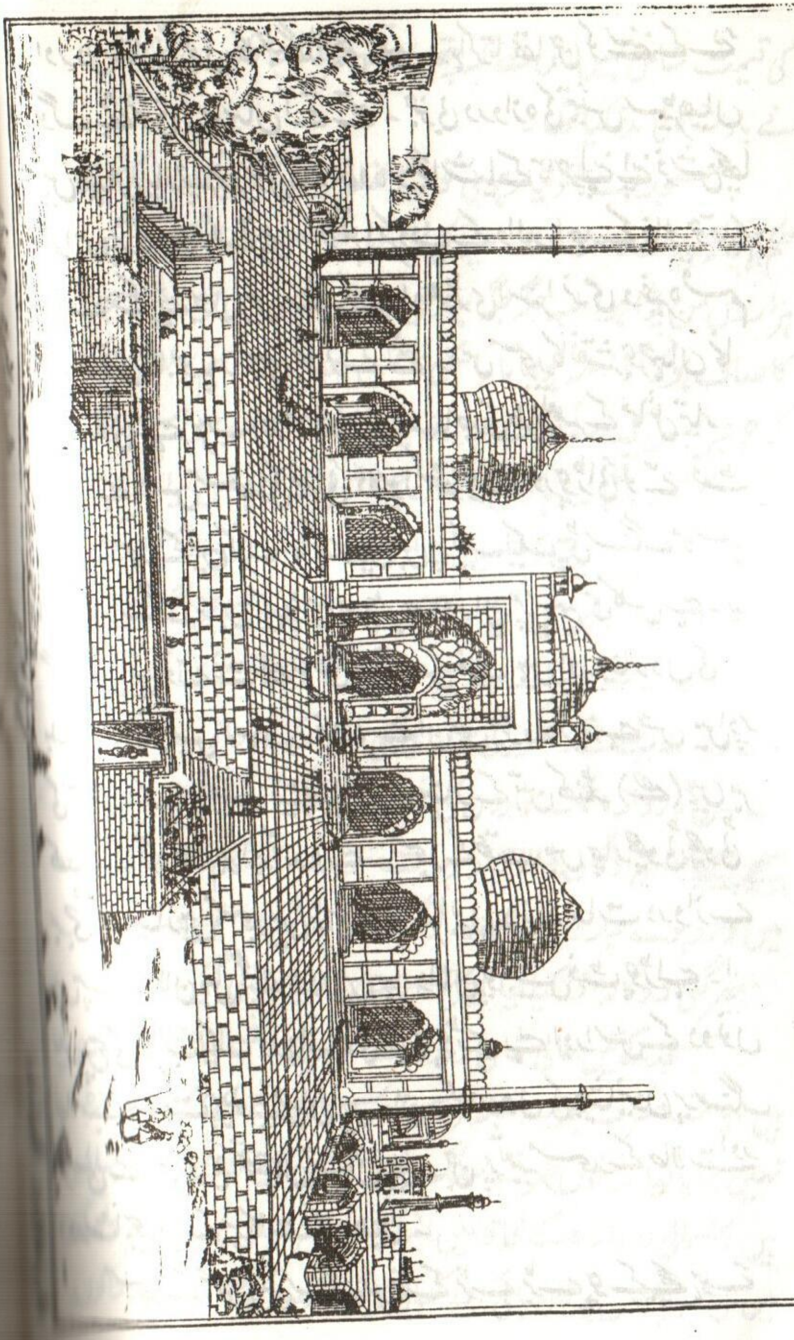

غربی سے ملحق کرسی دے کر بنائی ہے جسکی رفعت وشان کے آگے
گنبد اخضر پست ہے اور جس کی عظمت وجلال کے آگے ملاء اعلی
گرد ہے۔

یہ مسجد فیض بنیاد، اعزاز النساء بیگم محل شاہ جہاں بادشاہ نے
۱۵۶۵ھ یا ۱۶۵۰ء بمطابق ۲۴ سنہ جلوس بنائی ہے۔ ان بیگم
کا خطاب اکبر آبادی محل تھا اسی سبب سے یہ مسجد بھی اکبر آبادی
مشہور ہوگئی۔ اس مسجد کے تین گنبد اور سات در ہیں۔ مسجد
کی عمارت ۶۳ گز طویل اور ۷۰ گز عریض ہے۔ تمام سنگ سرخ
کی ہے۔ مگر پیش طاق اس کا سنگ مرمر کا پرچین کار ہے اور
اسکے آگے ایک چبوترا اونچا ۶۳ گز طویل اور ۷۰ گز عریض علیحدہ ہے
اور تین گز اونچا اس پر کٹہرا لگا ہوا ہے۔ اور اُس کے آگے ایک حوض
۱۲ × ۱۲ گز کا چشمہ۔ آفتاب وماہتاب پر شرف لے جاتا ہے
اور نہر کا پانی اس میں آتا ہے۔

در آن صحن حوضے بصد آب وتاب
درخشندہ چوں چشمہ آفتاب

اس کے گرد حجرے بنے ہوئے ہیں ۱۵۴ × ۱۰۴ گز ہر حجرے
کے آگے ایک ایوان ہے اور اُس کے سامنے سرتاسر چار گز عرض
چبوترا ہے۔ مسجد کے دروازے پر ایک کتبہ بخط نسخ چسپاں ہے۔

رہٹ کا کنواں : یہ بہت پرانا کنواں ہے۔ شاہجہاں
بادشاہ کے وقت پہاڑ تراش کر بنایا گیا تھا۔ اسی سے جامع
مسجد کے حوض میں پانی آتا تھا۔ اس کے پاس پانی کے بڑے

بڑے خزانے بنے ہوئے ہیں۔ پہلے ان میں پانی جمع ہوتا تھا پھر
جامع مسجد کے حوض میں پانی چڑھایا جاتا تھا۔ اب اس سے
جامع مسجد کی آب رسانی کا سلسلہ موقوف ہوگیا ہے کیوں کہ اس کنویں
پر رہٹ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا اسی نام سے یہ کنواں مشہور ہوگیا۔

مکبّر مسجد میں نمازیوں کی کثرت مور وملخ سے بھی زیادہ
ہوتی ہے خصوصاً جمعۃ الوداع میں۔ دس بجے دن کے بعد مسجد کے
اندر جگہ کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مسجد، صحن، دالان، چھتیں، چھجے
اور برج سب بھر جاتے ہیں حتیٰ کہ سڑک تک رک جاتی ہے اور جہاں
تک نظر جاتی ہے آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں فی الواقع دلی کی نماز جمعۃ
الوداع عیدین کی نماز سے بڑھ کر ہوتی ہے بس اتنی دور تکبیر کی آواز کیسے
جا سکتی ہے۔ دوچار صفوں میں آواز گونج کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے
شہزادہ سلیم ابن معین الدین اکبر ثانی نے ۱۸۲۹ء میں پیش طاق یعنی
محراب وسطیٰ کے سامنے ایک مکبّر سنگ باسی کا بنوا دیا جس وقت مکبّر
پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہا جاتا تھا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

کرۂ ارض : صحن مسجد کے شمال مشرق کے کونے میں ایک
کرۂ ارض بھی سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔

دھوپ گھڑی اسی کے محاذی ایک دائرہ ہندی
یعنی دھوپ گھڑی سنگ مرمر پر نمازِ اوقات جاننے کے لئے
بنی ہوئی ہے۔

درگاہ آثار شریف اسی طرف کے دالان کے ایک حجرے
میں آثار شریف منسوب جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم رکھے

ہوئے ہیں ۔ یہ گیارہ تبرکات شمال مغربی دالان کے حجرے میں بائیں جانب تھے ۔ جس کے آگے اورنگ زیب عالمگیر کے وقت میں الماس علی خاں خواجہ سرا نے ایک مجر سنگ سرخ کا جالی دار بنوایا ۔ دوبارہ ۱۸۴۲ء میں یہ مجر بنوایا کیونکہ پہلا مجر سخت آندھی کے سبب گر پڑا تھا

تبرکات : کل گیارہ تبرکات ہیں جن کی تفصیل یہ ہے ۔

(۱) چند پارے کلام مجید کے نوشتہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

(۲) چند پارے کلام مجید نوشتہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ

(۳) کامل کلام مجید نوشتہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

(۴) چند پارے کلام مجید نوشتہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ

(۵) موئے مبارک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

(۶) نعلین شریف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

(۷) قدم شریف

(۸) غلاف مزار اقدس

(۹) پنجہ شریف حضرت علی کرم اللہ وجہہ

(۱۰) چادر مبارک سیدۃ النساء بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا

(۱۱) غلافِ کعبہ شریف

کہا جاتا ہے کہ یہ سب تبرکات اورنگ زیب کے وقت میں جامع مسجد کی زینت بنے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

مدرسہ حسین بخش : یہ مدرسہ ۱۲۳۲ھ ۱۲۳۶ھ میں حسین بخش نامی ایک سوداگر نے جو قدیم پنجاب یا دلی کے پنجابیوں میں تھے تعمیر کرایا اور وقف کیا ۔ اس میں علاوہ مسجد کے

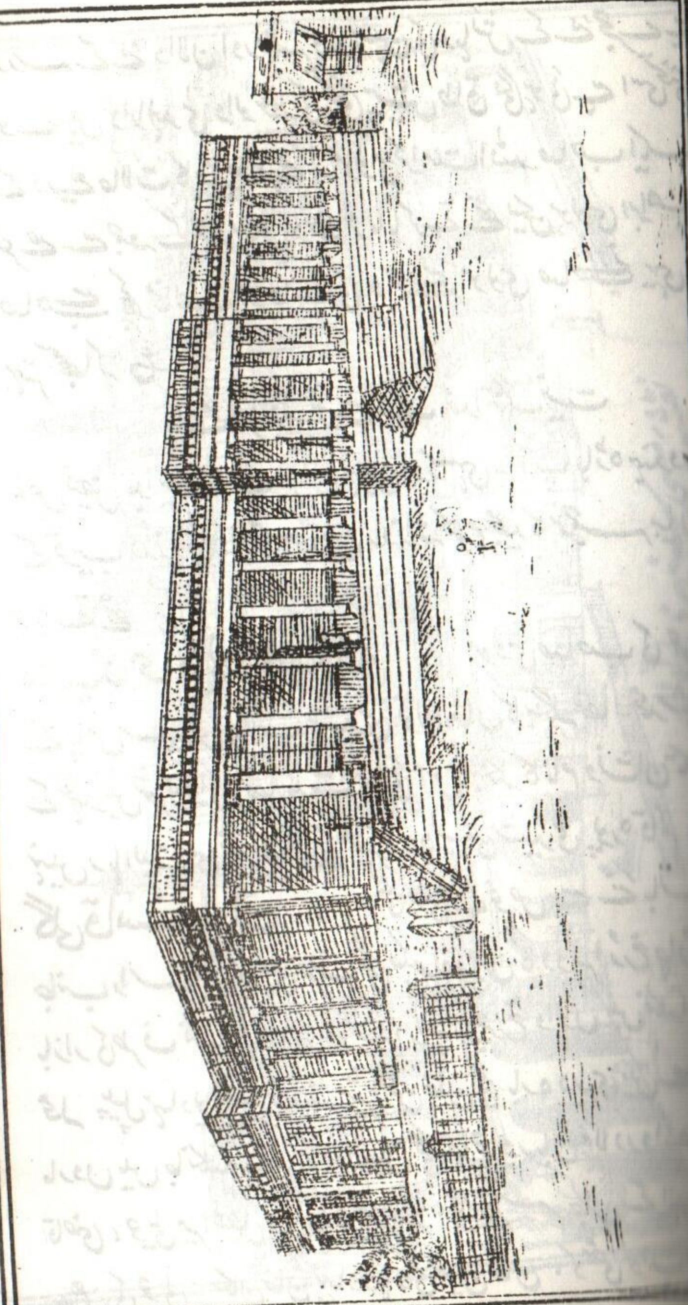

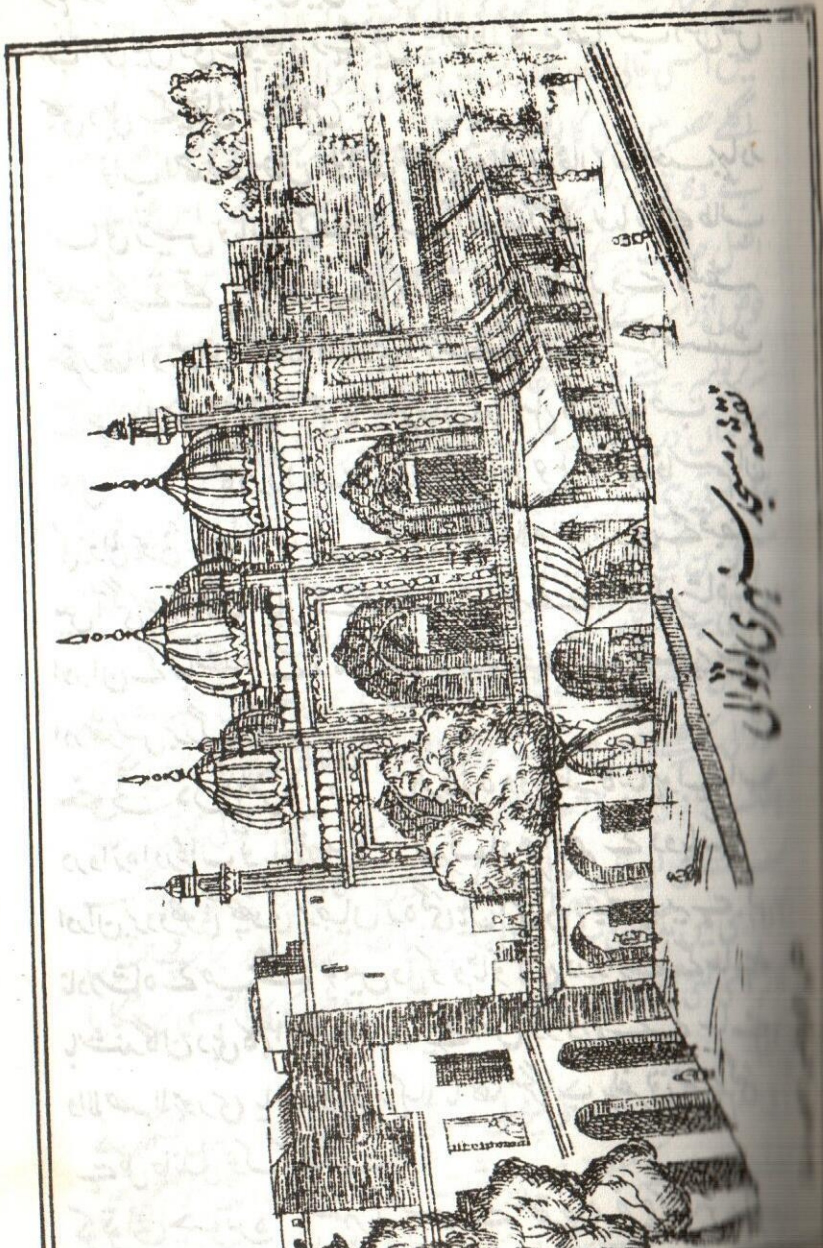

مدرسہ کے لئے دالان اور طلبہ و مدرسین کی رہائش کے لئے حجرے بنے ہوئے ہیں دارالہدیٰ والوعظ کی تختی پیش طاق لگی ہوئی ہے اسی تختی کے ذریعے حالات کا پتہ چلتا ہے ۔ مولوی کرامت اللہ صاحب ایک عرصے سے جمعہ کے جمعہ یہاں وعظ فرمایا کرتے تھے لیکن مولوی ابراھیم صاحب سے کچھ مخالفت ہو جانے کی وجہ سے مولوی صاحب نے یہی بہتر سمجھا کہ ع

پائے مرا لنگ نیست ملک خدا تنگ نیست

غرض فیض ہدایت سے ہے یہاں نہیں اور سہی ۔ آپ باڑہ ہندو راؤ کے قریب درزیوں والی مسجد میں روزانہ کلام مجید کا ترجمہ بیان فرماتے تھے

شیدی فولاد کا بنگلہ مولوی صاحب کی حویلی کے پاس سیدھی جانب شیدی فولاد خاں کا بنگلہ تھا ۔ محمد شاہ کے عہد میں شہر کوتوال تھا مدت ہوئی اس بنگلہ کا نام و نشان تک نہیں رہا البتہ اسی شہر کوتوال کی تعمیر کردہ بستی شیدی پورہ قائم ہے

گلی قاسم جان : قاضی کے حوض سے نئے بانس کی جانب راستہ میں داہنی طرف گلی حکیم بقا جس کا دوسرا رُخ چاوڑی بازار کی طرف نکلتا ہے اور دوسرا راستہ چرخ والوں میں نکلتا ہے محلہ پیپل مہادیو میں رستہ شیر افگن خان کی بارہ دری میں سے ماروں میں جانکلتا ہے ۔ بجرسٹ ہال گلی جاجم پوریاں ، لال دروازہ ، کرہ قاضی ، حویلی میر افضل دواخانہ ہمدرد ، گلی قاسم جان کے اندر نواب بدھن کی حویلی ، مکان خان بہادر ہادی حسین خان ، کوٹھی نواب صاحب

لوہارو ، مرغ خانہ جس میں نواب سعید احمد خاں رہتے تھے مگر اب اس میں دلی کے پنجابی رہتے ہیں ۔ احاطہ کالے صاحب اس میں بھی دہلی کے پنجابی رہتے ہیں ۔

نواب احمد سعید خاں ، نواب محمد ضیاء الدین خاں صاحب بہادر سابق رئیس لوہارو کے صاحبزادے اور جاگیر دار لوہارو تھے طالب تخلص کرتے تھے پانچ سو روپے ماہوار ریاست لوہارو سے وظیفہ مقرر تھا اور بلحاظ اعزاز باوفاداری گورنمنٹ نے آپ کو اکسٹرا اسسٹنٹ کے عہدہ پر مقرر کیا تھا ۔ گلی قاسم جان دراصل کالے صاحب کی حویلی کا دروازہ ہے یہ دروازہ اور حویلی نواب قاسم جان کی بنوائی ہوئی ہے ۔ بعد میں یہ حویلی حاجی غلام نصیر الدین کے قبضہ میں آگئی جن کو لوگ میاں کلے صاحب کہا کرتے تھے ۔ جو اکبر شاہ ثانی اور ان کے جانشین کے زمانہ تک زندہ رہے آپ بڑے پرہیزگار اور مقدس بزرگ تھے ۔

خونی دروازہ : یہ دروازہ دورِ مغلیہ کا بنا ہوا ہے اب دروازہ اور محراب تو باقی نہیں صرف اِدھر اُدھر کے دو پائے اور ان پر دو چھوٹی چھوٹی برجیاں رہ گئی ہیں اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ نادر شاہ نے جب ۱۷۳۹ء میں دلی کو لوٹا تو اسی دروازے کے سامنے باشندگان دہلی کا بڑا قتل عام ہوا پہلے اس دروازے کے سامنے والا حصہ لاہوری یا اردو بازار کہلاتا تھا مگر اب یہ تفریق ختم ہوگئی ہے کل چاندنی چوک کہلاتا ہے ۔

کوتوالی چبوترہ سنہری مسجد سے ملحقہ چاندنی چوک میں ہی ایک

قدیم عمارت ہے جو بالعموم کوتوالی کا چبوترہ کہلاتی ہے ۔ بادشاہی زمانہ میں اسی عالی شان عمارت میں شہر کی کوتوالی تھی اور اب بھی اس کے اگلے حصہ میں دلی کا پولیس ہیڈ آفس ہے اور یہاں جو پولیس آفیسر متعین ہے وہ قدیم دستور کے مطابق شہر کوتوال ہی کہلاتا ہے ۔ اس عمارت کی اصل حالت یہ تھی کہ یہاں ایک چوک تھا اسی گز مربع اس کے درمیان حوض اور اس کے شمال ترپولیہ جنوب میں کوتوالی چبوترہ ۔ اب نہ چبوترہ ہے نہ ترپولیہ ۔ کہتے ہیں یہ مقام ہمیشہ سے آفت زدہ ہے ۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں دریا بہتا تھا اور اس مقام پر بھنور پڑتا تھا کہ ہزاروں کشتیاں غرق ہوتی رہتی تھیں ۔ ایک زمانہ آیا کہ یہاں گھنا جنگل ہوگیا اور شیروں کا مسکن بن گیا کہ کسی ذی روح کو زندہ نہیں چھوڑتا تھا ۔ اب یہاں شہر کی کوتوالی ہے ۔ چور ڈاکو پکڑے جاتے ہیں اور طرح طرح کی سوبتیں اور صعوبتیں بھگتتے ہیں اسی چبوترہ کوتوالی سے ملی ہوئی سنہری مسجد ہے ۔ اس کوتوالی کے پچھلے حصہ میں ایک مشہور عالم دین مولانا فخر الدین کا مکان مسکونہ تھا جنگ آزادی میں بڑا معرکۃ الآراء مقام رہا ۔ اسی کوتوالی چبوترہ کے سامنے ہی ان تین شہزادوں کی لاشیں لٹکائی گئی تھی جن کو جنگ آزادی میں ہڈسن نے گولی کا نشانہ بنایا تھا اور یہیں برابر برابر پھانسیاں گاڑ دی گئی تھیں جن پر ہزاروں جان نثاران وطن کو پھانسی پر لٹکایا گیا ۔

روشن الدولہ کی پہلی سنہری مسجد

جنرل کننگھم نے عمارات قدیمہ کے متعلق جو یادداشت گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجی تھی اس میں اس مسجد کے لئے یہ ریمارک لکھا ہے " بعض عمارات فی الاصل

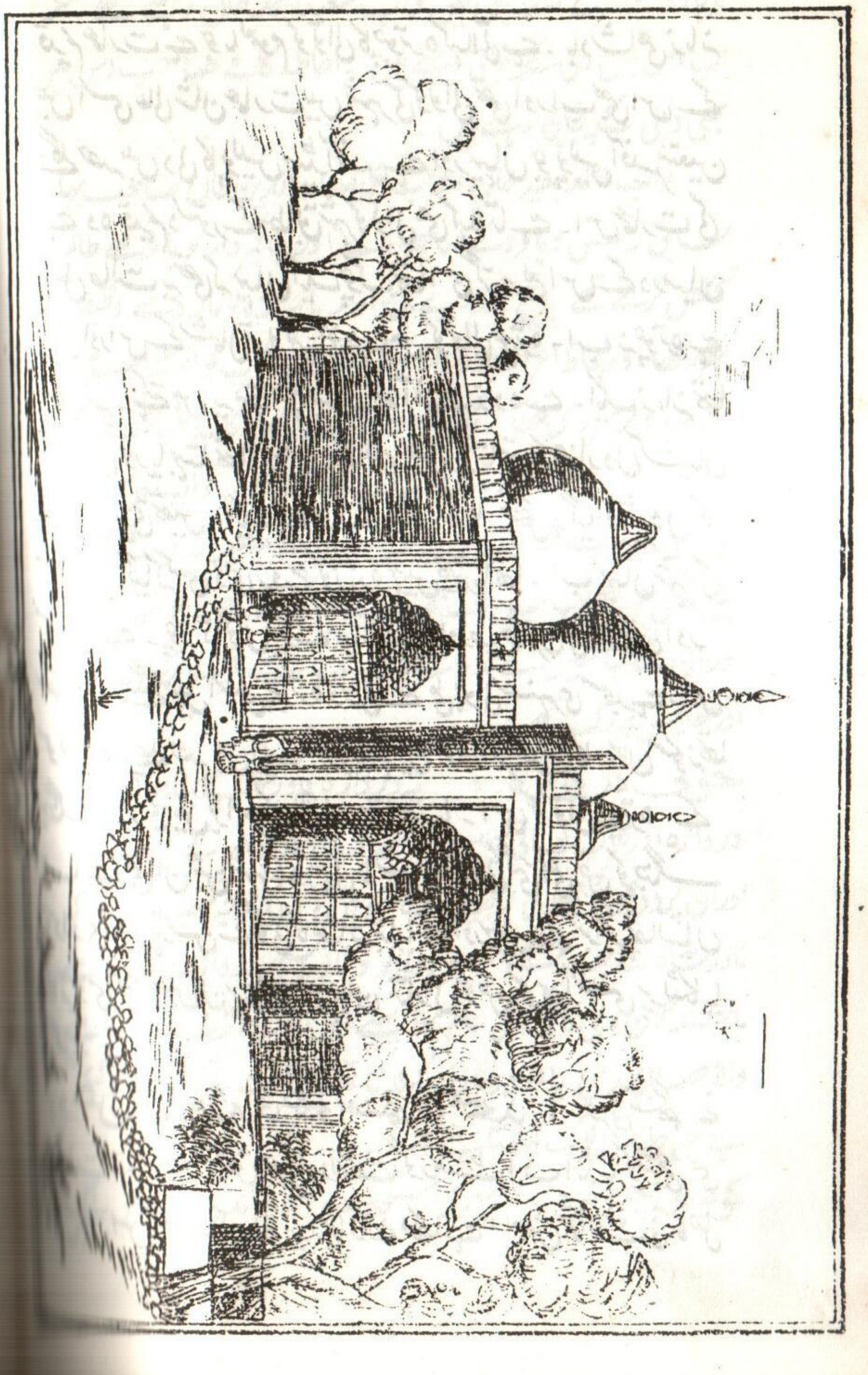

ایسی شاندار اور وقیع نہیں ہیں کہ گورنمنٹ ان کی نگہداشت کرے مگر ان میں تاریخی واقعات کی ایک ایسی خصوصیت ہوتی ہے کہ ان کا باقی رکھنا ضروری ہو جاتا ہے چنانچہ شہر دہلی کے بازار چاندنی چوک میں ایک چھوٹی سی مسجد روشن الدولہ ظفر خان کی ہے جسے اس نے ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷۲۱ء میں بعہد محمد شاہ ۱۷۱۹-۴۸ء شاہ بھیک کے لئے بنوایا تھا جہاں ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ مطابق ۲۶ مارچ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے چند گھنٹے بیٹھ کر شہر کی لوٹ مار کی اور قتل عام کا تماشہ جو اس مسجد کے اطراف ہو رہا تھا دیکھا تھا۔ یہ مسجد اڑتالیس فٹ لمبی اور نو فٹ چوڑی ہے۔

فوارہ لارڈ نارتھ بروک کوتوالی کے سامنے ترا ہے پر ایک بلند اور عالی شان خوشنما فوارہ لارڈ نارتھ بروک نے جو ۱۸۷۲ء تک دہلی میں رہا اپنے زمانۂ اقتدار میں بنوایا تھا اس کے بنوانے پر دس ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اس کے اوپر دھات کا ایک نہایت وزنی پیالہ لگا ہوا ہے۔ پھول پتے بھی نفیس بنے ہوئے ہیں۔ تمام فوارہ پر سیمنٹ کی استر کاری ہے یہاں سے ایک سڑک ملکہ کے باغ کے برابر کوڑیا پل سے ہوتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کی سڑک سے جا ملتی ہے اور دوسری راہ سے سیدھی فتح پوری مسجد کی جانب جاتی ہے۔

مور سرائے : جنگ آزادی سے پہلے یہاں کاغذی محلہ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں لارڈ ہملٹن نے ایک لاکھ پانچ سو ستر روپے صرف کر کے ایک سرائے بنوائی اور اس کا نام ہملٹن سرائے رکھا اس کے بعد مور نامی ایک انجینئر نے اس سرائے کی برجی پر مور کی

نقشہ گھنٹہ گھر و ٹاؤن ہال وغیرہ

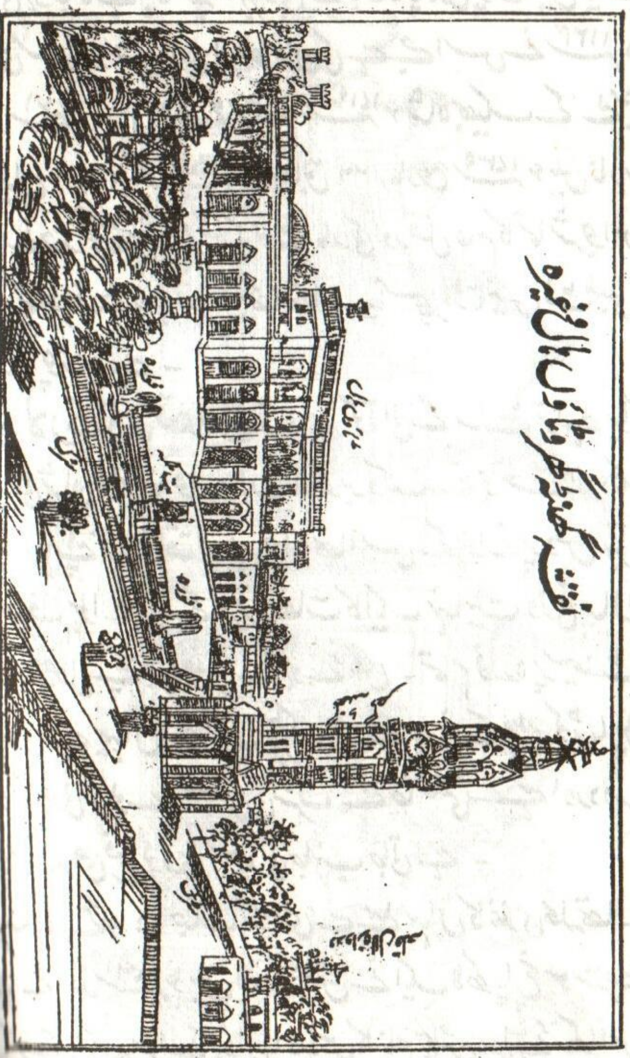

تصور لگائی تو لوگ مور سرائے کہنے لگے اب چاہے آپ اس کو مور کی شکل سے منسوب کریں یا انجنیئر مور کے نام سے واقعہ اصل یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۱ء میں میونسپل کمیٹی اس کو ایک لاکھ پینسٹھ ہزار روپیہ میں الیسٹ انڈیا ریلوے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ پھر اس میں ریلوے کے ملازمین رہنے لگے۔ یہ عمارت بہت وسیع پختہ اور عمدہ ہے۔ قدیم پنجاب کے یا دلی کے پنجابیوں میں کچھ لوگ اپنے ناموں کے ساتھ مور والے لکھتے ہیں ان کا اس عمارت سے کیا تعلق ہے یہ تحقیق طلب ہے۔

کٹڑہ دھولیاء: یہ وہ مقام ہے جہاں سے دسمبر ۱۹۱۲ء میں لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند پر بم پھینکا گیا تھا اسی کے آگے بائیں جانب اشرفی کا کٹڑہ اور اس سے ملا ہوا کٹڑہ بھنگی ہے یہاں کپڑا فروشوں کی تھوک فروشی کی دوکانیں ہیں جن میں اکثریت دلی کے پنجابیوں کی ہے۔

گھنٹہ گھر اس عمارت کے مشرق و مغرب میں چھوٹے سنگ مرمر کے چبوترے حوض بنے ہوئے ہیں۔ یہ کھیلیاں مویشیوں کے پانی پینے کے لئے ہیں۔ مشرق کی جانب والی کھیلی لالہ انبا پرشاد نے تیار کرائی تھی۔ مغرب کی جانب والی تعمیر شدہ کھیلی اسی سال لالہ مدن موہن لال نے سنہ ۱۹۱۰ء میں تعمیر کرائی۔ گھنٹہ گھر ایک نہایت خوب صورت بلند اور مربع مینار ہے جس کے نیچے کے حصہ میں چاروں طرف در ہیں جن پر پچپن ہزار پانچ سو روپے لاگت آئی ہے اس میں بہت بڑا گونجنے والا گھنٹہ ہے۔ جس کے ڈائل یعنی سوئیاں چاروں طرف ہیں اور پاؤ آدھا اور پونا بھی بجاتا ہے یعنی ہر پندرہ

منٹ گزرنے کی آواز سناتا ہے ۔ اس کی آواز دور دور سنائی دیتی ہے اس میں ایک پھلی دھات سے تیار کردہ لگی ہوئی ہے جو چاروں سمتیں بتلاتی ہے ۔ جس جگہ اب یہ عمارت نظر آتی ہے کسی زمانہ میں یہاں ایک ہشت پہلو حوض تھا جس کے چاروں طرف سوا سو گز میں ثمن بازار تھا اور دراصل یہی چاندنی چوک تھا اس چوک کے گرد نصف دائرے کی شکل میں اب بھی ہزاروں دوکانیں ہیں ۔

نئی سڑک چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر کے جنوب میں یہ نئی سڑک نکلی ہے ، جس کا انگریزی نام ایجرٹن روڈ ہے یہ سڑک دوسری طرف شاہ بولا کے بڑے بازار کے پاس جا نکلتی ہے ۔

ملکہ کا باغ یہ باغ شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا کا تعمیر کردہ ہے اس کا سن تعمیر ۱۰۶۰ھ یا ۱۶۵۰ء ہے ۔ یہ باغ چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے سامنے واقع ہے ۔ مرور ایام سے اس میں بہت کچھ تغیر اور تبدیلی ہو گئی ہے ۔ اس کا طول ۹۷۰ گز اور عرض ۲۴۰ گز ہے اس باغ کی وہ چہار دیواری تو اب باقی نہیں ہے جس پر جا بجا برج بنے ہوئے تھے ۔ اب صرف چار برج رہ گئے ہیں ۔

کٹڑہ نیل یہ باغ کے شمالی رُخ پر واقع ہے اور ایک محلہ ہے جس میں ٹوپی والے اور پارچہ فروش پرانے رہتے ہیں ۔

کوچہ رائماں یہ عموماً رحمن کا کوچہ کہلاتا ہے اس کوچہ کا دوسرا دروازہ بلی ماراں میں نکلتا ہے ۔ دور مغلیہ آخر کا بنا ہوا ہے اور آخر میں حکیم اجمل صاحب کی ملکیت میں تھا یہ ایک برج کی مسجد کے راستے کے پاس سے ہو کر بازار بلی ماراں میں جا نکلتا ہے کوچہ

کے شروع میں ایک مسجد ہے ۔ پہلے یہ مسجد چھوٹی سی تھی ۔ ۱۳۱۷ھ میں غفور بخش سوداگر چھتری والے نے اسے وسعت دے کر دو منزلہ بنوایا ۔ اوپر کی منزل میں مدرسہ ہے ۔ اس مسجد کے جنوب میں ایک بہت بڑا سنگین حوض بنا ہوا ہے جس پر مکانات ہیں جن میں طلبہ رہتے ہیں اس مسجد کی کفالت خان صاحب غفور بخش ہی کرتے تھے پھر ان کے بیٹے محمد فضل عظیم اور محمد کریم الدین اس مسجد کی کفالت کرتے تھے ۔

کٹڑہ قطب الدین اس کٹڑہ میں کپڑا فروشوں کی تھوک فروشی کی دوکانیں ہیں

بلی ماراں گھنٹہ گھر سے فتح پوری جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی طرف ایک سڑک ہے یہ بھی شہر کا ایک بازار ہے جس میں مختلف قسم کی دوکانیں ہیں ۔ وجہ تسمیہ اس کی یہ ہے کہ جس زمانہ میں یہاں دریا بہتا تھا ۔ بلی ماریعنی ملاح کثرت سے رہتے تھے لیکن عوام زیادہ تر بلّی بکسر الراء بولتے ہیں اس بازار میں

(۱) گلی سوداگراں (۲) گلی گول گپّے والی
(۳) حویلی حسام الدین حیدر
(۴) کٹڑہ بجواریاں (یہیں سے گلی قاسم خان کو راستہ جاتا ہے)
(۵) کٹڑہ عالم بیگ
(۶) مدرسہ ۔ نواب لوہارو کی کوٹھی کے بالاخانے پر
(۷) بارہ دری شیر افگن
(۸) گلی رائے بہادر شیو شہائے مل
(۹) گلی میراں والی گلی سکھ دل سنگھ

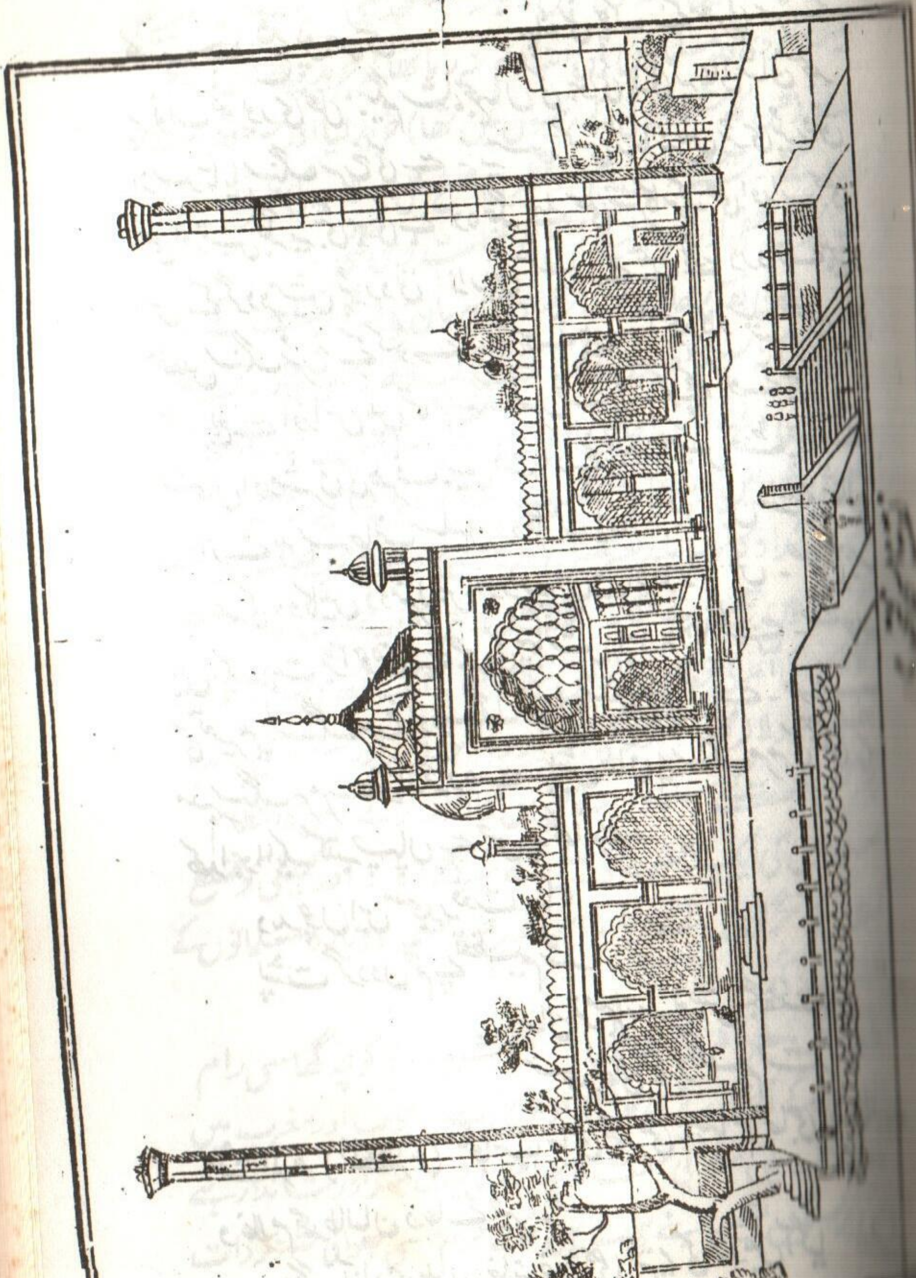

(۱۰) گلی اور مسجد قطبی بیگم ۔ نیا بازار ہیں ۔ یہاں سے راستہ چاوڑی بازار کی طرف چلا جاتا ہے ۔

حویلی حسام الدین حیدر دور آخر مغلیہ کی بنی ہوئی حویلی ہے ۔ حسام الدین حیدر لکھنؤ کے کوئی رئیس تھے پھر دہلی میں رہنے لگے ۔ ان کے دو بیٹے مظفر الدولہ اور نواب حسین مرزا بہادر شاہ عالم ثانی کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ۔ نواب حسین خاں لال قلعہ کے ناظم تھے ۔ اب یہاں حویلی تو کوئی نہیں متعدد کوچے آباد ہیں اور ان میں دلّی کے پنجابی رہتے ہیں ۔ انھیں میں ایک گلی ہے جس کا نام عبدالرزاق شیشہ والوں کا چھتہ ہے ۔ یہ عبدالرزاق صاحب راقم الحروف کے والد ماجد حاجی محمد یوسف مرحوم و مغفور کے والد کے بڑے بھائی (تایا) تھے ۔

کٹڑہ ریوڑی پہلے یہاں ایک محلہ تھا جس میں تار کش کثرت سے رہتے تھے ۔ اب چند ہی مکان باقی ہیں ۔ مکانات کو توڑ کر ایک کٹڑہ بنا دیا ہے جو اللہ دیا والوں کا کٹڑہ کہلاتا ہے اس میں مارواڑیوں کی کپڑے کی آڑہت ہیں ۔ کٹڑہ کے کونے پر ایک مسجد ہے جو کٹڑہ ریوڑی کی مسجد کہلاتی ہے ۔ اسی سے متصل کوچہ گھاسی رام اور کوچہ برج ناتھ ہیں

حویلی حیدر قلی خان اس کے بائیں طرف دور آخر مغلیہ کا پھاٹک ہے ۔ حیدر علی خاں محمد شاہ کے عہد میں توپ خانہ کا کمانڈر تھا ۔ منصب اس کا ہفت ہزاری اور خطاب اس کا معزالدولہ ناصر جنگ تھا ۔

مسجد فتح پوری چاندنی چوک کے مغربی سرے
پر نواب فتح پوری محل، بیگم شاہجہاں کی بنوائی ہوئی یہ عالی شان مسجد
از سر تا پا سنگ سرخ کی ہے۔ یہ مسجد کسی زمانہ میں بڑی پُر رونق
تھی اور جس جگہ یہ بنی ہوئی ہے وہ جگہ پہلے بھی شہر کا مرکز تھی اور اب بھی
اس کے گرد و پیش پُر رونق بازار ہیں مسجد کے تین بڑے دروازے ہیں
جنھیں سنگ سُرخ کے کنگورے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کا وسیع صحن ۸۰
گز مربع ہے اور اس میں تمام سنگ سرخ کے چوکے بچھے ہوئے ہیں
شمال اور مشرق کی طرف بیس فٹ اونچے اور ستائیس فٹ چوڑے
دروازے ہیں سہ جانب مسلسل دوکانیں ہیں۔ جس میں مشرق شمال
کے حصہ کی دوکانیں دو منزلہ ہیں اور اب ان میں دفاتر ہیں۔ صحن مسجد
میں ایک بہت بڑا حوض ہے جس کی پیمائش ۱۶ x ۱۴ گز ہے۔ مسجد
کی تعمیر میں سنگ سرخ اور سنگ خارا استعمال کیا گیا ہے۔ صرف
منبر سنگ مرمر سے تیار کردہ ہے۔ پیش طاق پر سنگ مرمر کی تختی پر
کھدا ہوا ایک کتبہ چسپاں ہے جس پر لکھا ہے۔

دید چوں ایں مسجد رفعت پناہ
پشت گردوں خم پے تعظیم شد

سال ترمیم از سر نوحش بگفت
مسجد عالی نکو ترمیم شد

۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) منجانب حاجی محمد تقی باہتمام حاجی قطب ال
و غلام محمد طالبان دعائے خیر۔"

جنگ آزادی میں یہ خانہ خدا بھی تعزیر کی زد میں آگیا

اس کی دوکانیں ضبط کرلی گئیں۔ بلکہ مسجد بھی انیس ہزار روپیہ میں
نیلام کردی گئی۔ مسلمانوں میں اتنا دم نہ رہا تھا کہ خرید لیتے لالہ چھنامل
نے (جن کا شمار دلی کے رئیسوں میں تھا) خرید لیا اور مسلمان دیکھتے
رہ گئے۔ ۱۸۹۲ء میں انجمن راشدین صلح کل اسلامیہ کی طرف سے
جائداد وقفی اور تنسیخ نیلام کی درخواست دی گئی۔
خوبی تقدیر حاکم وقت رحم دل مہربان ہوا۔ گورنمنٹ نے لالہ
کو پانچ آنہ سینکڑہ سود کے حساب سے ایک لاکھ دس ہزار روپے دیکر
دوکانیں وغیرہ خریدنا چاہیں اور اس کے معاوضہ میں ایک گاؤں
تحصیل پلور میں دینا چاہا مگر لالہ نے انکار کر دیا چنانچہ ۱۸۹۲ء میں
اس جائداد کا کرایہ بذریعہ تحصیل (سرکاری) وصول کرکے سرکاری
خزانے میں جمع ہونے لگا۔ ۱۸۹۵ء میں کرایہ جمع شدہ اور اس
گاؤں کی آمدنی جو پچیس ہزار میں نیلام ہوا۔ ایک لاکھ دس ہزار روپیہ
اصل و سود لالہ چھنامل کو دیکر بقیہ پندرہ سو روپیہ اور مسجد کی جائداد
بغیر کسی قیمت کے مسلمانوں کے حق میں واگذار کرکے اس کا انتظام
مسلمانوں کی ایک دس رکنی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ اور کمیٹی کو ضلع
کمشنر کی نگرانی میں دے دیا۔ اس طرح یہ مسجد دوبارہ مسلمانوں کے
قبضہ میں آئی۔

نمک حرام کی حویلی : مشن روڈ کوچہ گھاسی رام
مغلیہ دور کے آخر کی یہ بڑی شاندار حویلی ہے جنوب اور مغرب میں
دو پھاٹک ہیں مغربی سمت کا پھاٹک بہت بلند اور شاندار ہے
جس پر سنگین نشیمن بنے ہوئے ہیں نمک حرام منشی بھوانی شنکر ذات

کاکھتری تھا۔ یہ سربرآوردہ رئیسوں میں سے تھا۔ یہ پہلے مرہٹہ ریاست گوالیار میں بخشی تھا۔ مرہٹوں نے دلی پر تسلط کیا تو انھوں نے منشی کو ایک بہت بڑی ذمہ داری پر دہلی میں فائز کیا لیکن منشی نے مرہٹوں سے غداری اور انگریزوں سے ساز باز کرلی۔ مرہٹوں نے اس کو سازش کے الزام میں موقوف کر دیا۔ انگریزوں سے ساز باز کرنے کے صلے میں منشی کو پینشن اور دیگر مراعات سے نوازا گیا اور پینشن اور مراعات اس کی اولاد در اولاد جاری رہی۔

چونکہ منشی مرہٹوں کے خلاف انگریزوں سے مل گیا تھا اس لئے مرہٹوں نے اس کو نمک حرام اور اس کی حویلی کو نمک حرام کی حویلی کہنا شروع کر دیا۔ منشی جی کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے انگریزوں سے شکایت کی چنانچہ برٹش گورنمنٹ نے اپنے ایک یار باوفا کے لئے نہ صرف احکام صادر کئے بلکہ عام منادی کرائی کہ نہ تو کوئی شخص منشی بھوانی شنکر کو نمک حرام کہے اور نہ ان کی حویلی کو نمک حرام کی حویلی لیکن اس منادی کا الٹا اثر ہوا اور ہر شخص کی زبان پر یہی چڑھ گیا۔ سچ ہے زبان خلق نقارہ خدائی ہوتی ہے۔

گندی گلی

مسجد فتح پوری سے سرائے احمد پائی کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی طرف ایک بہت لمبی گلی ہے یہاں عموماً کھتری لوگ رہتے ہیں یہ گلی جیش خاں کے پھاٹک میں جاکر نکلتی ہے۔ اس کے بعد گلی لاہوریاں ہے۔

گلی باغ دیوار

ملکہ کے باغ کی جنوبی دیوار سے لگی ہوئی جو گلی چلی گئی ہے وہی گلی باغ دیوار کہلاتی ہے۔

شب سہائے کی سرائے

جس طرح احمد پائی کی سرائے مسلمانوں کی ہے اسی طرح شب سہائے کی سرائے ہندوؤں کے لئے ہے اور دونوں سرائے ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔

سرائے احمد پائی

یہ سرائے ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۴ء) میں شیخ احمد پائی (قدیم پنجابی) دلی کے پنجابی سوداگران کی بنوائی ہوئی ہے اس کا صدر دروازہ ملکہ باغ کے غربی دروازے کے سامنے ہے جو آٹھ فٹ بلند اور گیارہ فٹ چوڑا ہے دروازے کے اوپر ایک ایک سہ درا ہے صدر دروازے کی پیشانی پر سرائے احمد پائی کندہ ہے۔ سرائے کے اندرونی مغربی سمت دس کوٹھریاں نیچے اور اسی قدر اوپر کی جانب ہیں سامنے برآمدہ ہے جس کی پیمائش ۷۰۰ فٹ ہے۔ اس کے دونوں جانب شمال اور جنوب میں چھ چھ کوٹھریاں دو منزلہ ہیں ان کے سامنے ۲۵ × ۷ فٹ کا برآمدہ ہے صحن ۷۰ × ۲۰ فٹ ہے صدر دروازے کے دائیں جانب لب سڑک دوکانیں اور اوپر دو بالا خانے ہیں اور اسی طرح بائیں طرف دوکانیں اوپر ایک کمرہ ہے سرائے سے ملحق ایک مسجد ہے جو احمد پائی کی مسجد کہلاتی ہے۔

پھاٹک نہر سعادت خاں

یہ شاہجہاں کے عہد کا بنا ہوا ہے۔ کھاری باؤلی کے بازار میں ہے اسی پھاٹک کے نام سے محلہ مشہور ہے اور اب اس محلے میں قدیم پنجاب سے آئے ہوئے دلی کے پنجابی آباد ہیں۔ یہ پھاٹک جیش خان کا بنوایا ہوا ہے۔ جس کا اصلی نام سیدی مفتاح تھا۔ یہ شاہجہاں اور

اورنگ زیب کے عہد میں تھے اس دروازے کی مرمت بعد میں فولاد خان نے کی جو جشن خان ھی کی اولاد میں سے تھا ۔ جب نادر شاہ نے دہلی کو تاخت و تاراج کیا تو یہی جشن خاں شہر دہلی کے کوتوال تھے ۔ سید ہی مفتاح جشن النسل تھے وہ دراصل نظام شاھی بادشاہانِ احمد نگر کے غلام تھے ان کا بڑا اعتماد تھا ۔ ۱۰۶۴ھ میں زمرۂ ملازمت شاہجہانی میں شامل ہوئے دربار شاہجہان سے جیش خان کا خطاب ، سہ ھزاری منصب اور پندرہ سو سوار ملے ۔ جیش خان کے پھاٹک کے اندر دوطرفہ درق کوٹوں عطاروں وغیرہ کی دوکانیں ہیں ۔ اسی پھاٹک میں راقم کے والد ماجد محمد یوسف صاحب مرحوم و مغفور کے ماموں عبدالحفیظ گندھک والوں کی دوکان تھی ۔ اندرون پھاٹک گلیاں ہیں جن میں قدیم پنجاب سے آئے ہوئے دلی کے پنجابی آباد ہیں ۔

داھنی طرف مسجد ، ایک برج کٹرہ پیران ، گلی سرس والی جس میں شمس العلماء میاں نذر حسین صاحب کا مکان تھا ۔ گلی مولوی عبدالحکیم میں میاں صاحب کا مدرسہ تھا ۔ مکان مولوی عبدالرشید اب یہاں چوراہا ہے ۔ سامنے تیلیوں کا پھاٹک اور اندر اسی نام کا محلہ ہے اور اس کے آگے بارہ دری نواب وزیر اور پھر بارہ دری کے مقابل پھاٹک ہے ۔ جس کو طوطا مینا کا بیچ کہتے ہیں یہاں بھی دلی کے پنجابیوں کے مکانات ہیں اور یہی راستہ نہر سعادت خان کو جاتا ہے تیلیوں کے پھاٹک کے اندر ھی گھی کا کٹرہ ہے ۔

بائیں جانب تمباکو کا کٹرہ ، گلی ہتھیگا بیگ (اسی کو دھوبی کا کٹرہ بھی کہتے ہیں) اس کے آگے کوچہ مولوی قاسم ہے اس میں بہت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللہ

مہر بانو قدیمی جہانگیر شاہ

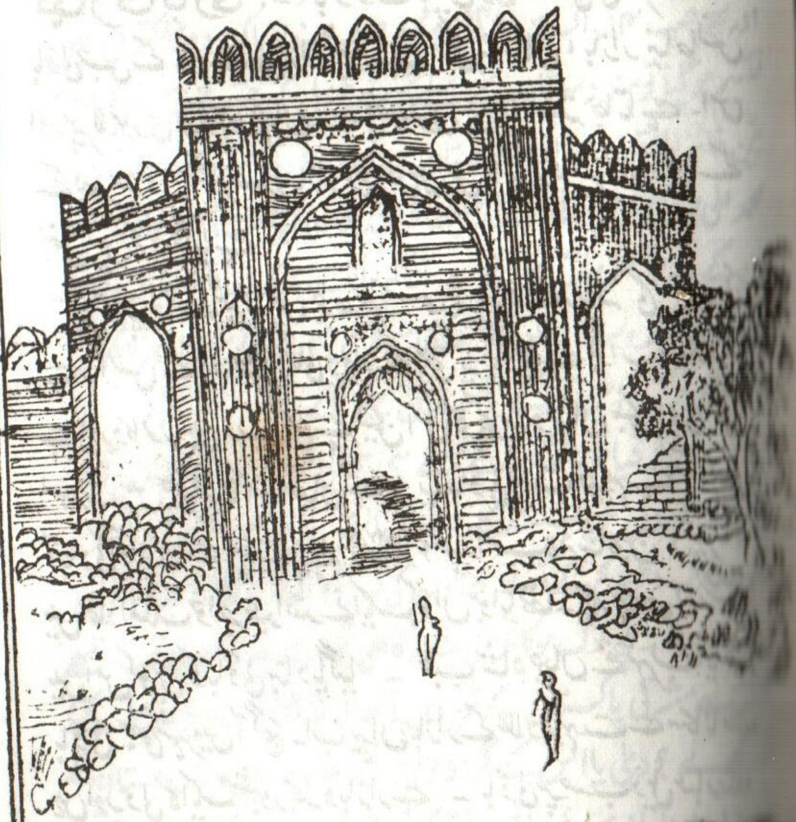

لکھوانے والے

دروازۂ منڈی

بشکریہ
نواب شمیم احمد (چغتائی)

سبھی گلیاں ہیں ۔ دائیں طرف گلی محمد زکریا محتسب کی مسجد گلی، امیر بخش باغیچی، گیندا مل، رنگ محل ہے ۔ بائیں جانب گلی نواب محمد باقر، گلی حاجی انعام اللہ، گلی رانگ والی، مسجد رمضان شاہ چھوٹا رنگ محل چھوٹا چرخہ دارہ، گلی چمڑے والان اور مغرب میں ایک چھوٹی سی سڑک ہے جو نہر سعادت خان کی بڑی سڑک سے آملتی ہے

کھاری باؤلی :- بازار کے بائیں رُخ بنگش کی سرائے وہ باؤلی جس کے نام سے یہ بازار مشہور ہے، گلی بتاشاں، بازار نیا جانس اور پھر لاہوری دروازہ جہاں سے فصیلوں میں راستہ جاتا ہے ۔ اس کے بعد بیرون شہر صدر بازار وغیرہ ہیں جن کا تذکرہ بیرون دہلی کے ضمن میں کر دیا گیا ہے

کوچہ نواب مرزا میں جو قدیم مسجد شیر شاہ کے زمانہ کی بنی ہوئی ہے ۔ اس کے احاطہ کی شمالی دیوار سے ملحق یہ باؤلی ہے جو اب معدوم ہے اور دکانوں میں دب گئی ہے لیکن اس کا کچھ پتہ ونشان بلکہ باؤلی کی صورت میں بھی اب تک عیاں ہے ۔ یہ باؤلی بہت قدیم ہے شاہجہاں آباد کی آبادی سے بہت پہلے ۱۵۴۵ء عہد اسلام شاہ بن شیر شاہ میں عماد الملک خواجہ عبداللہ نے ایک کنواں بنوایا تھا ۔ چھ برس بعد ۱۵۵۱ء میں اس کنویں کو باؤلی بنا دیا گیا ۔ جب شاہ جہاں نے شہر بسایا تو یہ باؤلی بھی شہر میں آگئی ۔ اب یہاں بازار کے علاوہ بہت سے مکانات ہیں اور دلی کا ایک مشہور محلہ و بازار ہے ۔ باؤلی پر حسب ذیل عبارت کا کتبہ لگا یا ہوا ہے ۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

(۱۵) دلی کے پنجابی سوداگران کی پاکستان آمد

۱۹۳۲ء میں مسٹر میکڈانلڈ نے کمونل ایوارڈ کے ذریعہ تمام فرقوں کو فرقہ وارانہ بنیاد پر صوبائی حکومتوں کے لئے اپنے نمائندگان منتخب کرنے کا حق دیا تو ہندوستان میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے اور پھر جب ۱۴ / اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر ہند و پاک دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا تو ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن فائز الاقتدار ہوا اور پاکستان میں گورنر جنرل کی حیثیت سے قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے اقتدار سنبھالا اور خان لیاقت علی خان مرحوم ان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے ۔ قیام پاکستان کے بعد اسی فرقہ واریت کی وجہ سے ہندوستان میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اور لاکھوں مسلمان ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے آئے ۔

یوں تو قیام پاکستان سے پہلے ہی پنجابی سوداگراں کی معتدبہ تعداد پاکستانی شہروں میں بسلسلہ کاروبار رہائش پذیر تھی مگر قیام پاکستان کے بعد ترک وطن کر کے آنے والوں کی تعداد کا اندازہ لگانا حدِ امکان سے باہر ہے ۔ کچھ لوگ جو کلکتہ کی بندرگاہی تجارت میں مصروف تھے کلکتہ سے مشرقی پاکستان کے شہروں ڈھاکہ چٹاگانگ وغیرہ چلے گئے اور کچھ نے جو دہلی یا اس کے گرد و نواح کے علاوہ شمالی ہندوستان کے شہروں میں آباد ہوئے باقی نے ترکِ وطن کرنا پسند نہ کیا اور وہیں مقیم رہے وہ آج بھی وہیں آباد ہیں ۔

اگرچہ صورت حال اس امر کی متقاضی تھی کہ نئے وطن میں تنظیم نو

کے ساتھ آباد کاری کی جاتی مگر پاکستان پہنچتے ہی لوگوں میں نفسا نفسی کا سماں پیدا ہو گیا اور امداد باہمی کے اصولوں پر قائم کی جانے والی برادری مختلف طبقات میں بٹ گئی ۔ انہی ترک وطن کرنے والوں میں کچھ بے مایہ اور بے سہارا لوگ ایسے بھی تھے جو اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے ۔ چنانچہ ہمدرواں برادری میں سے کچھ لوگوں کی تحریک پر جن میں جناب شیخ حاجی محمد مستقیم مرحوم انبالہ والے اور جناب خواجہ محمد عمر صاحب منشی محمود والے صاحبان کے نام سرفہرست ہیں ۔ دلی کے پنجابیوں کی پاکستان میں اولین بستی " دہلی کالونی " واقع چودھری خلیق الزماں روڈ نزد کلفٹن آباد ہوئی ۔ حاجی محمد مستقیم تادم حیات اسی بستی میں مقیم رہے اور جناب خواجہ محمد عمر صاحب اسی بستی میں آباد ہیں ۔ کچھ لوگوں نے جو مکانات یا فلیٹ خریدنے کے متحمل تھے شہر کے مختلف علاقوں میں فلیٹ خرید کر ان میں رہائش اختیار کرلی ۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے پاکستان بننے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے لئے ایک طرز جدید کی کالونی " دہلی مرکنٹائل ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کرکے وہاں سکونت پذیر ہوگئے ۔

چوتھا باب

تذکرۃ الرجال (۱۶)

جیسا کہ سابقہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ دلی کے پنجابی سوداگران نامی معاشرے کے افراد جن میں امیر، غریب، صنعت کار، تاجر عمال حکومت اور عمائدین شہر سب ہی شامل ہیں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف شہروں کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی پھیلے ہوئے ہیں اس لئے کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے لئے ان کی صحیح تعداد معلوم کرلینا بعید از قیاس ہے ۔

اس سے پہلے کہ میں ان انگنت اور لاتعداد افراد میں سے کچھ قابل ذکر حضرات کا تذکرہ کروں، ضرورت اس امر کی محسوس کر رہا ہوں کہ اس معاشرے میں پائے جانے والے ان خیالات سے بھی قارئین کو باخبر رکھوں کہ اہل معاشرہ میں سے کچھ اس کو قوم کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ وسیع اور لامحدود معاشرہ مختلف برادریوں کا فیڈریشن یعنی مرکز ہے اور اس میں شامل ہر شخص اپنے نام کے آخر میں لفظ " والے " کے ساتھ اپنا ذریعہ معاش

یا آبائی تجارتی نشان (گوت) کا اظہار بلا شبہ اس امر کی دلیل ہے مزید اس لئے بھی کہ علمائے دین و دانش کے قول کے مطابق قومیں مردوں کی پشت سے، ملتیں دین و مذہب سے اور برادریاں ہم پیشہ لوگوں کی یکجا معاشرت سے بنتی ہیں چنانچہ اس معاشرے کا اصطلاحی نام قوم کے بجائے وفاقی مرکزی برادری موزوں ترین ہے۔ (ملاحظہ ہو اس معاشرے کے ایک عظیم ادارے "جمعیت پنجابی سوداگران (دہلی) رجسٹرڈ کراچی کے فارم برائے رکنیت اور فہرست اراکین)

دہلی کے پنجابی سوداگران نامی معاشرے میں جو نسلاً بعد نسل تجارت پیشہ افراد پر مشتمل چلا آرہا ہے۔ لوگ نئی اور پرانی گوتوں کے علاوہ آل بھی استعمال کرتے ہیں جن میں شمسی اور چاندنہ سرفہرست ہے

گوت، امر واقعہ یہ ہے کہ اصلی الاصل اریں ہندی نظام ذات کے تین طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں، چوتھی ذات یا طبقہ ان کمزور مفتوحین کا ہے جو اریں سے پہلے اس ملک کے مالک تھے۔ ان تینوں طبقوں میں پہلا طبقہ برہمن اپنے مذہبی تقدس اور دوسرا کھتری روایتی جانبازی کے لئے مشہور ہے تیسرا سب سے اہم طبقہ جو ویش کہلاتا ہے اپنی محنت کشی کے سبب ملکی استحکام کا ضامن ہے۔ اس طبقہ ذات میں تاجر صنعت کار کسان کے علاوہ ہر وہ ہنرمند شامل ہے جس پر ملکی ترقی و خوش حالی کا ہمیشہ سے دارومدار رہا ہے۔ جس قدر لاتعداد کاروبار اس ذات سے متعلق ہیں اتنی ہی گوتوں کا تعلق بھی اسی ذات سے ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ چوتھی ذات جو مفتوحین کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آریں فاتحین ملک کے علاوہ واضعین قانون بھی تھے اور بحیثیت فاتح قوم مفتوحہ

کی اپنی فوقیت و برتری کے ساتھ اس کا احساس غلامی بھی ہر دم تازہ رکھنا چاہتے تھے، مزید یہ کہ ان کو (آرین) بحیثیت آقا ایسے بندۂ بے دام (مفت کے غلام) لوگوں کی ضرورت تھی جو ان کا حکم ماننے کے لئے ہر وقت تیار رہیں۔ چنانچہ انھیں وجوہ کے پیش نظر "واضعین ذات" آریں نے ذات شودر کی بنیاد ڈالی اور ہر وہ کام جس کو وہ اپنے لئے عیب تصور کرتے ہیں یا (انسانیت سوز ہوتے) اس ذات کی ذمہ داری قرار دیتے تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسانی جان کی قربانی کی ضرورت پیش آئی غریب شودر کی شامت آئی، اسی ظالمانہ قانون سے محفوظ رہنے کے لئے اقوام مفتوحہ کے بے شمار افراد ترک وطن کرکے جنوبی ہند چلے گئے اور آج بھی آدی باسی اور اچھوت کے نام سے مشہور ہیں۔

کیونکہ دلی کے پنجابی سوداگران میں گوتوں کے علاوہ "آل" بھی استعمال کرنے کا رواج ہے، اس لئے گوتوں کے علاوہ آل سے متعلق بیان بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ پہلے میں آل سے متعلق ھی بیان کرنا چاہتا ہوں شمسی سے متعلق تو آپ بہت کچھ سابقہ سطور میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اس لئے پہلے آل اور چاندنہ سے متعلق عرض ہے۔ آل۔ زبان اردو کے بیشتر الفاظ کے مرجع وماخذ تین اہم زبانوں میں یہ لفظ جس طرح اور جن معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے، عربی میں الف ممدودہ کے ساتھ یعنی آل ہو تو اس کے معنی ہندی زبان میں سرنیم یا آبائی لقب ہے۔ چاندنہ جو ایک آل ہے، ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چاند کی روشنی۔ دراصل جس طرح کچھ ہندی نسل لوگوں کا خیال ہے وہ

سورج دیوتا کی اولاد ہیں اسی طرح کچھ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ چاند دیوتا کی اولاد ہیں، چنانچہ اسی نسبت سے یہ لوگ چاند کی روشنی یا اولاد کہلاتے ہیں واضح رہے لفظ چاند ہندی زبان سے حاصل کردہ ہے۔

گوت: علاوہ ان چار ذاتوں کے، درجہ بندیوں (۱) برہمن (۲) کھتری (۳) ویش (۴) شودر جو اس سے پہلے بیان کی جا چکی ہیں ہندو معاشرے میں اور بہت سی ذیلی ذاتیں پیشہ وارانہ بنیاد پر قائم ہیں جو گوت کہلاتی ہیں۔ ان کا کوئی فرد بھی اپنی گوت کے علاوہ کسی دوسری گوت میں نہ کھاتا ہے نہ بیٹھتا ہے اور نہ ہی شادی بیاہ کرتا ہے۔

یہ ہے اس تحقیق کا نچوڑ جو گوت سے متعلق مسٹر بخشش سنگھ نجار ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری گورنمنٹ کالج پٹیالہ اور مسٹر بودھا پرکاش ڈائریکٹر آف انسٹیٹیوٹ آف انڈکس اسٹڈیز کوروکشیتر یونیورسٹی انڈیا نے اپنی کتاب "پنجاب زیر سلاطین ۱۰۰۰ء سے ۱۵۲۶ء" میں پیش کیا ہے۔

ماضی میں نہ تو علوم و فنون میں موجودہ دور کی سی رنگا رنگی تھی اور نہ ہی دیگر کاروباروں (پیشوں) میں ایسی گہما گہمی۔ جملہ تجارت صرف چند بنیادی اشیاء کے گرد گھومتی تھی اور ان ہی سے متعلق چند گنے چنے تاجر تھے، اور دودھ فروش گوالہ۔ رائس مرچنٹ یعنی چاول فروش چاولہ، سبزی فروش، فروٹ مرچنٹ کنجڑا، گندم یعنی گیہوں فروش، کشتی والا، بٹلہ مشترکہ کاروبار کرنے والے (کارندے)، چوتھائی، چوتھ نامی ٹیکس وصول کرنے والے کے

ناموں سے مشہور و معروف تھے، اور اہل ہنر میں باڑی کے علاوہ کالسیہ، کولسہ، سرولنے پٹوے وغیرہ مشہور تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں نصف سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے ناموں کے ساتھ شیخ، مرزا، میر یا خان کا لفظ لگاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ افغانستان، ایران، ترکی یا عرب سے آئے ہیں بلکہ جن بزرگوں نے انھیں مسلمان کیا انھوں نے (ان لوگوں نے) ان بزرگان دین کا لقب بطور عقیدت مندی و برکت اختیار کر لیا (عہد اسلامی کا ہندوستان، ادارۃ المصنفین پٹنہ)

اسی جذبہ عقیدت مندی و برکت کے تحت دلی کے پنجابی سوداگراں میں سے کچھ لوگ اپنے ناموں کے ساتھ قادری، صدیقی اور کھتوریہ وغیرہ لگاتے ہیں، صدیقی سیدنا صدیق اکبرؓ، قادری پیران پیر شیخ عبدالقادرؒ، اور کھتوریہ شیخ کھتوؒ سے عقیدت کے لئے رکھتے ہیں

صرف دولت مندوں، امیروں یا با اثر لوگوں ہی کے حالات لکھنے اور پڑھنے کے لائق نہیں ہوتے بلکہ بہت سے غریب اور گمنام لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی زندگی کے حالات سبق آموز اور مشعل راہ ہوتے ہیں ایک انسان کا بہترین مطالعہ اس کی اپنی زندگی اور کردار ہوتا ہے قدرت نے جہاں پھولوں کو ایک شان اور اعلیٰ مقام عطاء کیا ہے وہاں کانٹوں کو بھی اپنی عنایتوں سے نوازا ہے، چاند کی ضیا اور ایک ذرہ کی چمک میں اگر بغور مشاہدہ کیا جائے تو بظاہر تو فرق معلوم ہو گا مگر حقیقت میں کچھ اتنا فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں ہی ایک نور کے آئینہ دار ہیں ایک کی فلک گیر ٹھنڈی اور صاف روشنی اگر آنکھوں کو سرور بخشتی ہے

تو دوسرے کی خاک نشینی اور چمک راہ گیروں کے قدم لیتی ہے اور لگا ہوا کو خیرہ کیے بغیر نہیں رہتی۔

میری انتہائی کوشش یہی رہی ہے کہ میں خود کو صاحبِ ثروت یا بااثر لوگوں تک محدود نہ رکھوں بلکہ برادری کے ہر اس شخص کے ایسے کارناموں کو اجاگر کروں اور منظرِ عام پر لاؤں جو اس نے برادری کیلئے انجام دیئے ہوں کیونکہ اپنی ذات کی بہتری اور اپنے عزیز و اقارب کی بھلائی کی خاطر تو ہر شخص حتی الوسع جد و جہد کرتا ہی ہے لیکن مبارک اور قابلِ احترام وہ لوگ ہیں جو اجتماعی بھلائی اور عوامی فوائد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں اکثر لوگوں نے عدم توجہی کا مظاہرہ کیا مگر کچھ ہمدردانِ برادری نے میری حوصلہ افزائی بھی کی اور برادری کے تاریخی حالات میں دلچسپی لیتے ہوئے مجھے ہر طرح اپنی مدد و اعانت کا یقین دلایا جس کے لئے میں ان کا انتہائی مشکور ہوں۔

وما توفیقی الا باللّٰہ

علیہ توکلت والیہ

عطاء الرحمٰن

مشاہیر

جس طرح پھل، پھول اپنی اپنی خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہوتے ہیں اسی طرح انسان بھی اپنے اوصاف کے سبب مقبول و معروف ہوتے ہیں۔ انسانوں میں کسی کی وجہ شہرت درازیٔ عمر کے ساتھ پیدا ہو جانے والی معاملہ فہمی ہوتی ہے۔ تو کسی کی دولت و حشمت، بعض لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی سماجی خدمات کی بدولت آسمانِ شہرت پر چمکتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہی صاحبِ اوصاف لوگ معاشرتی اصطلاح میں مشاہیر کہلاتے ہیں اور ہر چھوٹے بڑے معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔

زیرِ تذکرہ دلی کے پنجابی سوداگران میں بھی لاتعداد مشاہیر موجود ہیں۔ اور ان سب کو احاطہ تحریر میں لانے کے لئے میری معلومات محدود اور کتاب میں جگہ ناکافی ہے چنانچہ ان دونوں خامیوں کے پیشِ نظر ندرت اسی میں محسوس ہوئی کہ فی الوقت ایسے مشاہیر کے ناموں سے جو کسی بھی عنوان سے میری اطلاع میں ہیں۔ اپنی موجودہ تالیف کو مزین کر کے بقیہ کو تذکرہ اہل برادری کی اشاعت تک اپنے ذہن میں محفوظ رکھوں۔

چونکہ تذکرہ اہل برادری کے ضمن میں مرتب کی جانے والی کتاب کی اشاعت بغیر تعاون اہل برادری ممکن نہیں بدیں وجہ میں عوام برادری سے ملتمس ہوں کہ وہ میری اس سعی کو کامیاب بنانے کی غرض سے اپنا نام پتہ

و دیگر مختصر کوائف سے مجھے عطاء الرحمٰن ۱۲ نواب منزل، آرام باغ کراچی مطلع فرمائیں۔

ان مشاہیر سے متعلق جو میرے علم میں ہیں بہت غور و فکر کے بعد یہی بات انسب محسوس ہوئی کہ پہلے ان ناموں کی گروہ بندی کر لی جائے۔ چنانچہ ان سب کو چار مختلف حصوں یا زمروں میں ترتیب دیکر سلسلہ اشاعت اس طرح قائم کیا ہے۔

ا۔ بزرگان برادری:۔

اس ضمن میں ان مشاہیر کے نام درج کئے گئے ہیں جو میری نگاہ میں اپنی فہم و فراست کے لحاظ سے صائب الرائے ہیں۔ بالفاظ دیگر حسب برادری میں دماغ کا درجہ رکھتے ہیں۔

ب:۔ رہبران برادری:۔

اس ضمن میں ان مشاہیر کے نام درج کے گئے ہیں جو اس تجارت پیشہ برادری کو نئی نئی راہوں سے روشناس کراتے ہوئے میرے خیال کے مطابق تعلیم و ترقی کی جانب راغب کر رہے ہیں۔

ج: معماران برادری:۔

اس ضمن میں دور حاضر کے ان مشاہیر کے نام درج کئے گئے ہیں جو اپنی سماجی کارگذاریوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اور میرے خیال میں برادری کا موجودہ مقام انہی کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔

د: امرائے برادری:۔

اس ضمن میں ان مشاہیر کے نام درج کئے گئے ہیں جو عصر حاضر کے

کامیاب تاجر ہیں۔ تجارت ان کی بام عروج پر ہے۔ وجہ شہرت خود ان کی اپنی شان امارت ہے چونکہ برادری کے اکثر رفاہی و فلاحی ادارے انہی کی سخاوت پر جاری و ساری ہیں اس لئے برادری میں صاحبان خیر اور حاتم دوران کے ناموں سے مشہور ہیں۔

سلسلہ "الف"

چند معروف بزرگانِ برادری

شیخ حاجی شفیق الرحمن کپڑے والے ولد شیخ فضل الرحمن مرحوم
" حافظ محمد احمد " " محمد یحییٰ چوڑی والے
" معراج الدین چانولہ میاں سنز " " علاؤالدین چانولہ۔
" عبدالحق عرشی " " عبدالرزاق مرحوم۔
" عبدالغنی کلکتہ والے " " عبدالصمد مرحوم۔
" ارشاد احمد کھتوریہ " " مشتاق احمد کھتوریہ
" محمد صدیق سویجہ " " عبدالمجید سویجہ۔
" حاجی محمد صدیق کراچی والے " " عبدالغنی کراچی والے
" احمد دین چھتری والے " " سراج الدین مرحوم۔
" احمد دین سوت والے " " نصیرالدین " ۔
" محمد نواب عتیقی " " عبدالحق مرحوم۔
" عبدالجبار لالٹین والے " " عبدالرزاق لالٹین والے
" عبدالجلیل موتی والے " " عبدالمجید موتی والے
" فضل الرحمن سنو وائٹ والے " " عزیز الرحمن مرحوم۔
" عبداللہ قمر ——— " " مقبول الٰہی مرحوم۔
" عبدالمغنی مغل " " عبدالغنی لاہور والے۔
" عبدالحمید بجلی والے " " عبدالواسع بجلی والے۔

شیخ محمد الیاس — بجلی والے ولد شیخ محمد دین گوروں والے
" خواجہ محمد عمر منشی محمود والے " " احسان الٰہی منشی محمود والے
" حاجی محمد رفیع شمسی کپڑے والے " " محمد صدیق کپڑے والے
" حاجی ممتاز الدین چوتھائی " " چودھری جمال الدین چوتھائی
" محمد اسمٰعیل چانولہ " " شیخ کرم الٰہی گلٹ والے
" محمد رفیع چچا پیلی بھیت والے " " محمد شفیع مرحوم
" محمد ایوب ٹاٹ والے " " محمد صدیق ٹاٹ والے
" محمد ادریس اشرف " " محمد صدیق مرحوم
" ذکی احمد اپن سیاہی والے " " محمد صدیق اپن
" عبدالماجد شمسی " " محمد عبداللہ آگرہ والے
" مظفر حسین نیازی ڈھاکہ والے " " منظر حسین نیازی
" حاجی محمد یوسف دری والے " " محمد اسحاق دری والے
" فضل ربی نمونہ والے " " محمد احمد نمونہ والے
" محمد تقی بٹلہ رنگ والے " " محمد سمیع (مرحوم)
" محمد سعید گندھک والے " " محمد حفیظ گندھک والے
" محمد ایوب پیتل والے " " انعام اللہ پیتل والے۔
" محمد اسمٰعیل قادری ملکی اسٹیشنری والے " " نجم الحق مرحوم
" محمد صالحین کپڑے والے " " محمد اسمٰعیل بزاز
" محمد احمد چھابڑے " " محمد عمر چھابڑے مرحوم
" محمد یوسف لاہور والے " " عبدالسلام بی۔اے لاہور والے
" عبدالمنین صدیقی " " عبدالکریم موتی والے

شیخ عبدالخالق پھل مشین والے ولد شیخ عبدالہی چھاننہ
〃 سردار احمد۔ محمد دین اینڈ کمپنی 〃 〃 شجاع الدین کلکتہ والے
〃 منظور احمد لیس والے 〃 〃 فضل دین لیس والے
〃 محمد یحییٰ ٹین والے 〃 〃 محمد یوسف ٹین والے
〃 محمد مسلم آگرہ والے 〃 〃 محمد ایوب آگرہ والے
〃 مہر الٰہی سنگاپور والے 〃 〃 محبوب الٰہی مرحوم۔
〃 محمد عاقل کانپور والے 〃 〃 محمد فاروق مرحوم۔
〃 آفتاب خلیلی 〃 〃 خلیل الرحمٰن سوت والے
〃 محمد سعید لالی والے 〃 〃 محمد رفیع لالی والے۔
〃 ستار، رشید پرفیوم والے 〃 〃 عبدالرشید دوائی والے
〃 انیس الرحمٰن کالیہ 〃 〃 محمد یعقوب کالیہ۔

سلسلہ "ب"

چند معروف رہبران برادری

۱۔ سیاست سے وابستہ چند مشاہیر

شیخ عبدالخالق اللہ والے ولد شیخ شمس العارفین مرحوم
(ممبر قومی اسمبلی و نائب رئیس بلدیہ کراچی)
〃 جاوید سلطان جاپان والے ولد 〃 سلطان احمد مرحوم
(وزیر خزانہ حکومت سندھ)
〃 جمیل احمد باڑی 〃 〃 نور احمد باڑی مرحوم
(کونسلر بلدیہ عظمیٰ کراچی)
〃 فضل مبین تارگھی والے 〃 〃 محمد اسحٰق مرحوم
(کونسلر بلدیہ عظمیٰ کراچی)
〃 محمد سعید سوت والے 〃 〃 محمد ادریس مرحوم
نائب چیئرمین کنٹونمنٹ بورڈ کراچی
〃 محمد ہارون باڑی ولد 〃 محمد سلیمان مرحوم
(رکن کنٹونمنٹ بورڈ کراچی)
〃 محمد یونس صدیقی 〃 〃 حاجی محمد یوسف مرحوم
سابق چیئرمین۔ بی۔ ڈی۔
〃 محمد متین کپڑے والے 〃 شیخ فضل کریم مرحوم
سابق چیئرمین۔ بی۔ ڈی۔
〃 صدیق وہاب سگریٹ والے 〃 〃 عبدالوہاب سگریٹ والے مرحوم
سابق رئیس بلدیہ۔

۲۔ قرطاس وقلم سے وابستہ مشاہیر برادری

شیخ منظور احمد ایم اے، ادب وصحافت ولد شیخ علی احمد مرحوم

" انوار الحق حقی، مدیر ماہنامہ قوم " " محمد رفیع مرحوم

" سلطان رفیع اللہ والے " " محمد رفیع مرحوم

(مدیر ماہنامہ سوداگر)

" ایوب شاہد کانپور والے " " محمد اسحٰق کانپور والے

(مدیر ماہنامہ قومی گزٹ)

" عبدالرحمٰن صدیقی " " محمد صدیق مرحوم

(مدیر ماہنامہ ڈیفنس جنرل)

" جمیل الرحمٰن بھولا والے " " فضل الرحمٰن مرحوم

" یونس ریاض " " ریاض الدین بٹلہ

(وابستہ روزنامہ جنگ)

" محمد اشفاق انعام الٰہی " " انعام الٰہی چاندنہ

(ادیب وانشاء پرداز)

" عبدالجبار، اے ستار " " عبدالستار کمانیہ مرحوم

(ادیب وانشاء پرداز)

" نسیم احمد باغپتی " " منظور احمد لاہور والے مرحوم

(ادیب وانشاء پرداز ومورخ)

" نسیم صالح " " شجاع الدین چوغتائی

(ادیب، انشاء پرداز)

شیخ اقبال راجہ لوہیے ولد شیخ محمد احمد لوہیے۔

" عبدالمتین چانولہ " " محمد احمد چانولہ مرحوم

۳ عدلیہ سے وابستہ مشاہیر برادری

جسٹس تنزیل الرحمٰن نگینہ والے ولد خلیل الرحمٰن نگینہ والے مرحوم

شیخ حبیب احمد رحمانی " شیخ عبدالکریم اللہ والے "

" تنویر احمد ملتانی " " مشتاق احمد ملتانی "

" ذکی احمد " " حکیم احسان الٰہی صاحب

" عبدالقیوم خلیل " " محمد عتیق جھابڑے صاحب

" نثار احمد لبس والے " " احمد دین کلکتہ والے مرحوم

" جی نواز ڈھاکہ والے " " محمد ادریس ڈھاکہ والے

" محمد کامل ایڈووکیٹ " " محمد عمر پیتی والے صاحب

" خالد الیاس لاہور والے " " محمد الیاس لاہور والے صاحب

" خلیل احمد اللہ والے " " عمر الٰہی اللہ والے مرحوم

۴:۔ فن طب سے وابستہ

شیخ اخلاص احمد

" محمد صدیق چانولہ

" محمد یونس چاندنہ

" محمد اجمل

" محمد اقبال

شیخ منظور احمد۔

" اقبال احمد۔

" حکیم احسان الٰہی۔

" عبیداللہ

۵:۔ بنکوں سے وابستہ

شیخ محمد عثمان کشتی والے۔ ولد شیخ محمد رفیع تیزاب والے مرحوم

شیخ نسیم اختر ساحل کلکتہ والے ولد شیخ عبدالغنی کلکتہ والے
" عبدالہادی شاہد لالٹین والے " " عبدالجبار لالٹین والے
" ارشد الیاس لاہور والے " " محمد الیاس لاہور والے
" شکیل احمد تیزاب والے " " محمد شفیع تیزاب والے
" خالد الیاس چٹاگانگ والے " " محمد الیاس چٹاگانگ والے
" گلزار بلال انجنیئر " " عبدالستار بلال
" خالد سعید " " " محمد سعید کشتی والا
" خالد متین " " " محمد عبدالمتین
" مشتاق احمد چاندنہ " " محمد اسحاق چاندنہ
مسرؔ دہلوی ادیب و شاعر

۶ ب- درس و تدریس سے وابستہ

شیخ محمد عمر چاندنہ پروفیسر | پروفیسر محمد نقی چاندنہ
" محمد یاسین معصوم | محمد عثمان ٹلہ
" محمد یاسین بٹن والے۔ | سمیع الرحمٰن شمسی

(سلسلہ ج)

معماران برادری یا سماجی کارکنان

شیخ محمد یونس لاہور والے ولد شیخ سراج الدین پالش والے
" منظور احمد اللہ والے " " احمد دین اللہ والے
" ذکر الرحمٰن کپڑے والے " " شفیق الرحمٰن کپڑے والے
" بابو محمد تقی ٹین والے " " محمد احمد ٹین والے
" محمد نعمان چوتھائی والے " " محمد لقمان چوتھائی
" عمر الٰہی (حاجی) سوت والے " " محبوب الٰہی سوت والے
" محمد یوسف لدھیانہ والے " " محمد شفیع لدھیانہ والے
" محمد کامل چشمہ والے " " محمد صالحین ٹین والے
" حاجی محمد کامل شمسی " " محمد عمر ٹین والے
" محمد تقی ڈھاکہ والے " " محمد اسحاق کنگھی والے
" محمد ذکی شمسی فتح پوری والے۔ " " محمد شفیع فتح پوری والے
" محمد نسیم ٹلہ ——— " " محمد عبداللہ ولایت والے
" محمد اقبال پرفیومری والے " " نواب محمد تقی میرٹھ والے
" محمد عمر —— کپڑے والے " " محمد ابراہیم بیل والے
" محمد تقی سوت والے " " محمد رفیع لاہور والے
" محمد احمد پی کے ——— " " محمد حسین گوٹے والے
" محمد اسمٰعیل چاندنہ ——— " " محمد ابراہیم چاندنہ

شیخ محمد نقی چھتری والے ولد شیخ محمد ابراہیم چھتری والے

؍؍ محمد مسلم آگرہ والے ؍؍ ؍؍ محمد ایوب آگرہ والے

؍؍ عبدالباری خالد لالٹین والے ؍؍ ؍؍ عبدالجبار لالٹین والے

؍؍ عثمان غنی جبلپور والے ؍؍ ؍؍ محمد یحییٰ جبلپور والے

؍؍ عبدالستار موتی والے ؍؍ ؍؍ نورالدین موتی والے

؍؍ نور احمد چانولہ ؍؍ ؍؍ محمد احمد چانولہ —

؍؍ اقبال احمد نمونہ والے ؍؍ ؍؍ محمد احمد نمونہ والے

؍؍ ضمیر احمد اقبال اسٹیشنری والے ؍؍ ؍؍ حبیب الرحمٰن اسٹیشنری والے

؍؍ سلیم احمد بٹلہ ؍؍ ؍؍ ؍؍ محمد اقلیم بٹلہ ؍؍

؍؍ نواب احمد کپڑے والے ؍؍ ؍؍ محمد احمد کپڑے والے

؍؍ منظور احمد لیس والے ؍؍ ؍؍ فضل دین لیس والے

؍؍ شجاع الدین چوتھائی ؍؍ ؍؍ شہاب الدین چوتھائی

؍؍ محمد سلطان بین والے ؍؍ ؍؍ محمد تقی پین والے

؍؍ شمیم احمد موتی والے ؍؍ ؍؍ محمد دین بادشاہ موتی والے

؍؍ خالد بن سعید سوت والے ؍؍ ؍؍ محمد سعید سوت والے

؍؍ شمیم احمد فاروقی ؍؍ ؍؍ محمد فاروق رنگ والے

؍؍ زاہد انیس صدیقی پنی والے ؍؍ ؍؍ محمد انیس پنی والے

؍؍ عبدالسلام لوہے والے ؍؍ ؍؍ محمد ادریس لوہے والے

؍؍ حفظ الرحمٰن ڈالرانک والے ؍ ؍؍ محمد صدیق بی بام والے

؍؍ سلطان احمد چانولہ ؍؍ ؍؍ محمد احمد چانولہ

؍ منصور سلیمان ؍؍ ؍؍ سلیمان عزیز

شیخ اسلم سعید ٹاٹ والے ؍؍ شیخ محمد سعید ٹاٹ والے

؍؍ عبدالباسط زاہد لالٹین والے ؍؍ ؍؍ عبدالجبار لالٹین والے

؍؍ خباب احمد ٹینٹ والے ؍؍ ؍؍ خلیفہ محمد احمد ٹینٹ والے

؍؍ محمد ابراہیم مرشی ؍؍ ؍؍ عبدالحق مرشی

؍؍ اسلم الیاس لاہور والے ؍؍ ؍؍ محمد الیاس لاہور والے

؍؍ محمد سعید کشتی والے ؍؍ ؍؍ محمد صدیق کشتی والے

؍؍ جاوید خالق اللہ والے ؍؍ ؍؍ عبدالخالق اللہ والے

؍؍ شاہد الیاس پریس والے ؍؍ ؍؍ محمد الیاس پریس والے۔

؍؍ محمد یوسف شمسی ؍؍ ؍؍ محمد اصغر کانپور والے۔

؍؍ رحمت الٰہی تانبے والے ؍؍ ؍؍ مقبول الٰہی تانبے والے

؍؍ محمد اقبال بھولا والے ؍؍ ؍؍ الطاف الرحمٰن بھولا والے

؍؍ محمد اسلم کھلونے والے ؍؍ ؍؍ محمد یٰسین کھلونے والے

؍؍ مدثر الاسلام ؍؍ ؍؍ ذکی الاسلام عمر حیات والے

؍؍ سلطان احمد آزاد ؍؍ ؍؍ عبدالغنی لاہور والے

؍؍ جمیل غیاث الدین ؍؍ ؍؍ غیاث الدین۔

سلسلہ "د"

امرائے برادری

شیخ محمد عثمان اللہ والے ولد شیخ محمد اسمٰعیل اللہ والے

• محمد عثمان سوت والے 〃 〃 محمد یحییٰ سوت والے

〃 محمد عثمان کالیہ 〃 〃 محمد اسمٰعیل کالیہ

〃 محمد یحییٰ دواکی والے 〃 〃 محمد رفیع دوائی والے

〃 عبداللہ عبدالغنی سگریٹ والے 〃 〃 عبدالغنی سگریٹ والے

〃 محمد نقی نواب لیس والے 〃 〃 محمد تقی لیس والے

〃 محمد یوسف سوت والے 〃 〃 نور حسین سوت والے

〃 محمد یامین گھڑی والے 〃 〃 محمد یوسف صدیقی گھڑی والے

〃 محمد اسمٰعیل نیتی تال والے 〃 〃 کریم الٰہی نیتی تال والے

〃 ذکر الرحمٰن ٹاٹل والے 〃 〃 عبدالرحمٰن ٹھیکیدار

〃 فیروز الدین بوبجھ ہوٹل تاج محل والے 〃 〃 فیاض الدین بوبجھ چوڑی والے

〃 نواب احمد سوت والے 〃 〃 چودھری اقبال احمد کالیہ

〃 عبدالخالق گندھک والے 〃 〃 محمد حفیظ گندھک والے

〃 ضیاءالدین احمد احمد فوڈ انڈسٹری والے 〃 〃 ضمیر الدین احمد مرحوم

〃 الیاس احمد کشتی والے 〃 〃 حاجی فضل الٰہی کشتی والے

〃 محمد ادریس اللہ والے 〃 〃 محمد اسمٰعیل اللہ والے۔

شیخ یوسف اسمٰعیل ولد شیخ محمد اسمٰعیل کلکتہ والے

〃 محمد اقبال کالا کولا والے 〃 〃 احسان الٰہی دوائی والے

〃 محمد یوسف چاولہ والے 〃 〃 محمد اشفاق جاولہ رنیڈولک

〃 محمد احمد ٹمینٹ والے 〃 〃 خلیفہ محمد ادریس صابن والے

〃 محمد الیاس ڈالر والے 〃 〃 محمد صدیق بی کام والے

〃 عبدالستار ڈھاکہ والے 〃 〃 نواب عبدالمالک ڈھاکہ والے

〃 عظیم الدین ناگ پور والے 〃 〃 اقلیم الدین ناگ پور والے

〃 محمد اسحاق سوت والے 〃 〃 محمد جمیل سوت والے

〃 مہتاب الحق آنولہ والے 〃 〃 انعام الحق آنولہ والے

〃 سعید احمد کشتی والے 〃 〃 حاجی فضل الٰہی کشتی والے

〃 محمد سعید اون والے 〃 〃 عبدالخالق شیشہ والے

• محمد ذکی پیربجی 〃 〃 محمد یوسف پیربجی۔

〃 سمیع الرحمٰن گھڑی والے 〃 〃 انیس الرحمٰن گھڑی والے

تعارف ۱۔ شیخ شمیم احمد شمسی (لیس والے)

(ایم اے ایل ایل بی)

آپ مرحوم شیخ نواب الدین صاحب شمسی لیس والوں کے صاحبزادے، شیخ محمد دین صاحب مرحوم کے پوتے۔ شیخ مہر الٰہی صاحب مرحوم سرمے والوں کے نواسے، اور شیخ عبدالستار صاحب باڑی کے داماد ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے، بین الاقوامی تعلقات میں کراچی یونیورسٹی سے ایم، اے اور ایس، ایم لا کالج سے ایل، ایل، بی کیا ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۷ء ڈھاکہ میں مشنری کے کاروبار "میگھنا انجینئر" کے نام سے چلاتے رہے۔ بعدہٗ کراچی واپس آگئے اور اپنے والد کے قائم کردہ دوسرے اداروں احمد ٹریڈنگ لمیٹڈ، نواب لیس ملز، محمد دین کینئرز، شمسی انڈسٹریل کمپنی اور زونا پاکستان لمیٹڈ سے وابستہ ہیں، آپ روٹری کلب آف کراچی ایسٹ کے جوائنٹ سیکرٹری، سیکرٹری، نائب صدر اور صدر کے عہدوں پر کام کر چکے ہیں، اور منتخب ڈائرکٹر ہیں۔ روٹری کی جانب سے گروپ اسٹڈی ایکسچینج پروگرام کے تحت امریکہ میں پاکستان کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں، پاکستان میں روٹری ڈسٹرکٹ کے بہترین مدیر اور بہترین سیکرٹری کے اعزازات حاصل کرنے کے علاوہ روٹری ڈسٹرکٹ کانفرنس کمیٹی کے ممبر ہوئے اور

پاکستان میں روٹری ڈسٹرکٹ سب کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں — پف روٹری ٹریننگ انسٹیٹوٹ کے بورڈ کے مستقل ممبر اور موجودہ چیئرمین ہیں یہ ادارہ روٹری کلب آف کراچی ایسٹ، مغربی جرمنی کے سلائی مشینوں کے بنانے والے ادارے پف، اور زونا (پاکستان) لمیٹڈ کے باہمی اشتراک سے پاکستان میں صنعتی سلائی مشینوں کے میکنک کی تربیت کے لئے قائم کیا جارہا ہے، جس میں بعد میں پاکستان کے پڑوسی ممالک مثلاً سری لنکا، بھارت۔ نیپال۔ ایران — بنگلہ دیش وغیرہ کے افراد کو بھی تربیت دی جا سکے گی۔ حکومت سندھ کے قائم کردہ ادارے "مرکز بہبود برائے معذور بالغان"
(RGHABILITATION CONTRE FOR PHYSCILLY HANDICAPPE)
کے مشاوارتی بورڈ کے ممبر ہیں۔
جمعیت پنجابی سوداگران دہلی۔ کراچی کی مرکزی مجلس منتظمہ کے کئی بار رکن منتخب ہوتے رہے ہیں اور آج کل بھی رکن ہیں۔ اس ادارے کی مالیات کمیٹی لائبریری کمیٹی۔ دستور العمل کمیٹی وغیرہ کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور قانونی مشاورت بورڈ اور دیگر کمیٹیوں کے ممبر ہیں اس کے علاوہ حاجی فیاض الدین میموریل فنڈ کے چیئرمین ہیں امریکہ، یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے بیشتر ممالک کا سفر کر چکے ہیں مشاغل میں، مطالعہ، تصنیف و تحریر اور سوشل ورک شامل ہیں۔

تعارف ۲ :-

شیخ محمد عثمان بٹلہ

آپ شیخ محمد ابراہیم بٹلہ (مرحوم) کے بیٹے، شیخ ریاض الدین بٹلہ (مرحوم) کے بھتیجے اور جناب شیخ عبدالمتین صاحب صدیقی کے داماد ہیں۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو شہر دہلی کے ایک مشہور و معروف محلہ کشن گنج میں پیدا ہوئے تقسیم ہند سے قبل آپ کے والد کا شمار دہلی کے معززین رؤسا میں ہوتا تھا۔ اور شہر کے ایک مخصوص تجارتی مقام، صدر بازار کے وسط میں واقع گلی مٹکوں والی میں ان کی شاندار دکان تھی۔ جس پر شیخ محمد ابراہیم بٹلہ و شیخ ریاض الدین بٹلہ کے نام سے درآمدی و برآمدی کاروبار ہوتا تھا۔

مشہور تاریخ "واقعات دار الحکومت دہلی" کے فاضل مصنف جناب مولوی بشیر احمد نے اپنی کتاب کی جلد دوم کے صفحہ نمبر ۲۰۴ پر موری گیٹ کے اندر بائیں جانب اونچی مسجد اور شیلعوں کی مسجد کے درمیان واقع جس "کوچہ بٹلاں" کا تذکرہ کیا ہے وہ انہی کی آبائی املاک میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں صدر بازار سے متصل بارہ ٹوٹنی سے تقریباً ایک فرلانگ (۲۰۰ گز) کے فاصلہ پر واقع ڈپٹی گنج تک دکانوں کا ایک پورا بلاک بھی آپ ہی آبائی املاک میں شامل ہے اس بلاک میں تعمیر شدہ ایک دکان میں دہلی کے ایک مشہور ڈاکٹر زید احمد ابو انوار احمد کا مطب تھا۔ انوار احمد کا مطب آج بھی شاہراہ لیاقت کراچی پر موجود ہے۔ مذکورہ منقولہ و غیر منقولہ آبائی املاک کے حوالے سے موصوف کے لئے "توتڑوں کا

رئیس" جدی یا پیدائشی مالدار کا خطاب نہایت موزوں ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں آپ ترک وطن کرکے کراچی پہنچے اور سندھ مدرسۃ الاسلام سے حصول تعلیم کا آغاز کیا۔ اور ۱۹۶۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے ایس ایم کالج پہنچے۔ دوران تعلیم آپ کو اسکول اور کالج کی بزم ادب کا جنرل سیکرٹری رہنے کا اعزاز حاصل رہا ۱۹۶۴ء میں آپ نے بی۔ اے کیا۔ اور جامعہ کراچی پہنچے اور عمرانیات میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۶۷ء میں جامعہ کراچی نے آپکو بی ایڈ کی تدریسی سند سے نوازا۔ دوران تعلیم و تربیت آپ جامعہ کے شعبہ عمرانیات کے جنرل سیکرٹری اور ٹریننگ کالج میگزین کے معتمد اعلیٰ رہے۔

تکمیل تعلیم کے بعد شعبہ تعلیم سندھ میں شامل ہوئے اور فرائض کی انجام دہی کا آغاز موڈرن اسکول و کالج نزد تبت مارکیٹ سے کیا۔ یہاں موصوف کو اعزازی پرنسپل کے فرائض ادا کرنا پڑے۔ بعدہٗ ناظم آباد میں شعیب محمدیہ اسکول کا آغاز ہوا۔ اور آپ وہاں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ فی الوقت آپ سٹی گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول میں پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور میٹریٹ روڈ پر اپنے آبائی پیشہ تجارت میں منہمک ہیں۔ علم دوست، صاحب فہم و فراست، سنجیدہ و متین طبیعت کے مالک ہیں۔ ہنیں محتاج تعریف خوبی جسکو خدا نے دی۔

تعارف ۳ — شیخ محمد موسیٰ صاحب پتیل والے :

آپ حاجی محمد عثمان صاحب[1] پتیل والوں کے صاحبزادے ہیں اور اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں ۔ مرحوم شیخ نصیرالدین صاحب پتیل والوں کے پوتے ہیں اور جناب شیخ نوراحمد صاحب بن حاجی محمد اسحاق[2] صاحب باڑی مرحوم و مغفور کے نواسے ہیں ۔ ۱۹۳۷ء میں دہلی کے ایک مشہور و معروف محلہ کشن گنج میں پیدا ہوئے (یہ محلہ آج بھی محمڈن زون میں شامل ہے اور اس میں دلی کے پنجابی سوداگران رہتے ہیں)

قیام پاکستان کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آپ اپنے والدین کے ہمراہ کراچی پہنچے ۔ سٹی ھائی اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے ' ایس ' ایم کالج سے انٹر آرٹسٹ مکمل کیا ۔ بعدۂ اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے ۔

---

۱ ان کا تذکرہ یادرفتگان ص ۵۰۱ پر ملاحظہ فرمائیں

۲ ان کا تذکرے یادرفتگان ص ۱۲۵ اور تاریخ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ص ۲۱۲ پر ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں ۔

آج بھی ان کے جانشین ہونے کے ساتھ ان ہی کی طرح برادری میں منفرد مقام رکھتے ہیں ۔ خدمت برادری کا جذبہ آپ کو اپنے والد مرحوم سے ملا ہے

متانت سنجیدگی ۔ خوش مزاجی و خوش اسلوبی موصوف کے صفات میں شامل ہیں ۔ عوام میں بے باک اور راست گو مشہور ہیں ۔

شیخ منصور احمد صاحب سوت والے

آپ شیخ رحم الٰہی[1] سوت والے مرحوم کے صاحبزادے، کرم الٰہی[2] مرحوم کے پوتے، بابو خلیل الرحمٰن[3] کے بھتیجے، شیخ محمد شفیع مرحوم شاہدرہ والوں کے نواسے اور شیخ محمد رفیع مرحوم سوت والوں کے داماد ہیں، اور اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں

۱۹۵۰ء میں بمقام کراچی پیدا ہوئے۔ دینی و ابتدائی تعلیم مظہر العلوم جامع مسجد باب الاسلام سے حاصل کی اور مزید ثانوی تعلیم کے لئے سینٹ پیٹرک ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔

اسکول سے جاری ہونے والے جریدہ سینٹ پیٹرس کالنگ کے لئے جب بھی مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا آپ کامیاب رہے۔ اور مدیر کا اعزاز حاصل کرتے رہے اور یہ سلسلہ از اوّل تا آخر جاری رہا آپ ابھی میٹرک کا امتحان دے ہی رہے تھے کہ اچانک آپ کے

۱، ۲، ۳ شیخ کرم الٰہی مرحوم کو اپنے بڑے صاحبزادے شیخ رحم الٰہی مرحوم سے اسقدر محبت و انسیت تھی کہ انھوں نے اپنی کاروباری فرم کا نام کرم الٰہی، رحم الٰہی رکھا ہوا تھا۔ (یادرفتگان صہ ۵۳۳)

اہل برادری میں پائے جانے والے۔ مرحوم شیخ رحم الٰہی کے محاسن اسقدر ہیں کہ اُن سب کو تحریر کرنے کیلئے ایک علیحدہ باب کی ضرورت ہے

والد کا انتقال ہوگیا، جس کی وجہ سے گھر کی تمام ذمہ داریاں آپ کے ناتواں کاندھوں پر آپڑیں۔ بہت سے دوسرے مسائل کے ساتھ سب سے اہم مسئلہ معاش کا تھا۔ اور وہ انتہائی غور و فکر کا حامل تھا۔ چنانچہ اس کو حل کرنے کیلئے آپ نے میسیرز کے پی ٹینگرا اینڈ کمپنی میں ملازمت کرلی اور تعلیم بھی جاری رکھی۔ محنت کشی اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت آپ نے جلد ھی ترقی کی منازل طے کرلیں اور آپ معمولی کلرک سے ترقی کرکے سیلز مینیجر مقرر ہوئے پھر کراچی یونیورسٹی سے آپ کو بی کام کی سند ملی، بعد ازاں آپ نے ملازمت ترک کرکے آر۔ ایس گوہر اینڈ کمپنی قائم کی اور اپنے والد کے حسب خواہش اس میں انڈینٹنگ کا کام شروع کیا اور اپنی محنت و لگن سے اسکو کافی وسیع و مستحکم کرلیا۔

جذبہ خدمت برادری موصوف کو اپنے والد سے ملا ہے، انہی کی طرح خاموشی سے خدمت گذاری کرتے رہے بعدہٗ برادری کے عظیم ادارہ جمعیت پنجابی سوداگران سے وابستہ ہوگئے اور تادم تحریر وابستہ ہیں، کئی بار اس کی مجلس منتظمہ کے ممبر منتخب ہوئے اور آج کل بھی ہیں

آپ رشیدیہ لائبریری سب کمیٹی کے ناظم، حصول آراضی؛ امداد و آبادکاری؛ مالیات اور فروغ تعلیم؛ سب کمیٹیز کے رکن ہیں، ملنسار؛ بذلہ سنج؛ اور ہر دلعزیز ہونے کے ساتھ باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں بے باکی؛ راست گوئی آپ کی فطرت ہے

شیخ شفیق الرحمن صاحب بٹلہ

۱۹۴۲ء میں شہر دہلی کے ایک مشہور و معروف محلہ باغیچی اچھے جی میں پیدا ہوئے ان کے والد ماجد جناب جمیل الرحمن چھتری والے (مرحوم) برادری کی ایک معزز شخصیت تھے۔ صدر بازار دہلی میں حاجی میاں جان احمد جان کے نام سے چھتریوں کا ایک وسیع و مستحکم کاروبار تھا۔ مرحوم احمد جان کے یہ پوتے اور میاں جان کے پر پوتے ہیں۔ ابتداء ھی سے آپ کے خاندان کا شمار برادری کے معزز و متمول خاندانوں میں ہوتا ہے۔ دہلی میں کافی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ آپکی خاندانی ملکیت رہی ہے۔ باغیچی اچھے جی کے بہادر گڑھ روڈ سے ملحقہ حصہ پر واقع رہائشی مکانات کا پورا بلاک آپ ہی کے خاندان کی ملکیت ہے۔ مرحوم حاجی شہاب الدین باغیچی آپ کے نانا تھے اور نواب فخر الرحمن پٹنہ والوں کے آپ داماد ہیں۔

ابتدائی نشو و نما منفرد اسلامی ماحول میں ہوئی۔ قرآنی و دیگر دینی تعلیمات آپ نے مشہور عالم دین مولوی بشیر احمد مرحوم مغفور سے حاصل کی پھر ابتدائی و ثانوی تعلیم (میٹرک) ۱۹۵۸ء میں دو تعلیم گاہ سیکنڈری اسکول سے حاصل کی، ۱۹۶۲ء میں سندھ مسلم کالج سے بی۔اے کیا اور پھر ۱۹۶۴ء میں کراچی یونیورسٹی سے تاریخ میں

ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ کیونکہ سماجی خدمت کا شوق آپ کو اپنے باپ دادا سے ترکہ میں ملا ہے چنانچہ دوران تعلیم بھی آپ سندھ مسلم کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ اور بزم حسرت موہانی کے سرکردہ ممبران میں شامل رہے، ایم۔اے کے فوراً بعد ۱۹۶۵ء میں ترکی سفارت خانہ سے ترکی زبان سیکھی اور ڈپلوما حاصل کیا بعدہٗ ۱۹۶۵/۶۷ء میں یعنی دو سال تک۔ آل پاکستان سوشل سروس لیگ (جس کے سرپرست فیلڈ مارشل محمد ایوب خان (مرحوم) اور چیرمین محترمہ زاہدہ بیگم خلیق الزماں مرحوم وزیر صحت و سماجی بہبود تھیں) کے جنرل سکریٹری رہے۔ ۱۹۶۵/۷۱ء تک پنجابی سوداگر یوتھ لیگ کے جوائنٹ جنرل سکریٹری رہے۔ واقعات شاہد ہیں کہ اس عرصہ میں آپ کی انتھک کوششوں سے برادری کے جوانوں میں شعور برادری پیدا ہوا۔ اور وہ جمعیت کی جانب متوجہ ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۸۱/۸۴ء تک آپ جمعیت پنجابی سوداگران (دہلی) کے آنریری جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ جسکی روئیداد اور کارکردگی جمعیت کی سالانہ رپورٹس میں ہر سال شائع ہوتی رہی، موصوف آج بھی برادری کے عظیم ادارے کی مجلس منتظمہ کے فعال اراکین میں شامل ہیں۔ بولٹن مارکیٹ پر واقع فخر ماتری روڈ (سابقہ نیپئیر روڈ) کے اسلامی چوک پر حاجی احمد جان جمیل الرحمن ہوزری کی دکان اور کیپری ہوزری انڈسٹری علامہ اقبال روڈ پی۔ای۔سی۔ایچ سوسائٹی۔ آپکی نگرانی میں جاری ہیں، شہید ملت روڈ پر ایک خوشنما بنگلہ میں آپکی سکونت ہے۔ آپ چونکہ بلند کردار، باہمت و صلاحیت، سنجیدہ طبیعت اور ملنسار ہیں اسی لئے ہر دلعزیز ہیں۔

شیخ شمیم احمد صاحب پین والے

یہ ایک جواں سال و جواں ہمت فرد برادری ہیں۔ مرحوم شیخ محمد تقی پین والے کے بیٹے۔ شیخ محمد دین گھڑی والوں کے پوتے۔ اور برادری کے مشہور سماجی کارکن شیخ محمد سلطان صاحب پین والوں کے برادر اصغر ہیں۔ مرحوم شیخ عبدالرحمٰن آپ کے نانا۔ اور شیخ عبدالسلام لالٹین والے آپ کے پڑنانا (نانا کے والد) تھے ان سے متعلق یادرفتگان مرتبہ، سلطان رفیع صہ ۸۹ پر درج ہے۔ "دہلی میں قائم کی جانے والی "دلی کے پنجابی سوداگران" کی انجمن وکیل قوم پنجابیاں کے بانیوں میں سے تھے۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں دِلّی کے مشہور و معروف محلہ بارہ دری نواب وزیر میں پیدا ہوئے بعدہٗ پورا گھرانہ ایک دوسرے محلہ بسیرکاوالا باغ میں منتقل ہو گیا۔ اور قیام پاکستان تک وہیں مقیم رہا۔ تقسیم ہند کے بعد دیگر اہل برادری کی طرح آپ بھی اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ دہلی سے کراچی پہنچے۔ وسط شہر ایک متوسط درجے کے فلیٹ میں قیام کیا۔ اور پڑوس میں رہنے والی ایک نیک سیرت خاتون سے کلام ربانی کے علاوہ دیگر مذہبی امور کی تعلیم حاصل کی (نوٹ: اُن دنوں کراچی میں مذہبی درسگاہیں بہت کم، نہ ہونے کے برابر دُور دُور واقع تھیں۔ اکثر نیک سیرت خواتین بچوں کو اپنے گھروں میں مذہبی تعلیم دیتی تھیں۔

ابتدائی و ثانوی تعلیم تا میٹرک آپ نے میٹروپولٹن ہائی اسکول سے حاصل کی، موصوف چونکہ جدی سوداگر ہیں۔ اس لئے انھوں نے کامرس کو منتخب کیا اور بی کام کرنے کے لئے ۱۹۵۹ء میں گورنمنٹ کامرس کالج میں داخلہ لیا۔ بعدہٗ چار سال بعد تعلیم ختم کر کے اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے۔ موصوف اپنے بھائیوں کی طرح سنجیدہ طبیعت ہونے کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کے دلدادہ ہیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ کا عظیم کاروباری ادارہ "سلطان شاہد" ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے فی الوقت آپ دارالامان ہاؤسنگ سوسائٹی میں اقامت گزیں ہیں اور جمعیت پنجابی سوداگران (دہلی) کراچی کے جوائنٹ سکرٹری ہیں:

شلوار قمیض میں چست چھریرا بدن مسکراتا چہرہ کشادہ پیشانی دھیمی گفتگو یہ موصوف کا مستقل حلیہ ہے۔

شیخ خلیل الرحمٰن صاحب سوت والے

آپ شیخ محمد یوسف مرحوم کے فرزند اور جناب غلام جیلانی مرحوم کے پوتے ہیں۔ مرحوم علی محمد صاحب شملہ والوں کے نواسے اور مرحوم شیخ محمد اشفاق صاحب دری والوں کے داماد ہیں۔ محلہ حسام الدین حیدر بازار بلیماران میں اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے کچھ عرصہ بعد آپ کا گھرانہ حویلی حسام الدین سے احاطہ کالے صاحب شیشے والوں کے چھتہ میں منتقل ہوگیا۔ بعدہٗ یہ گھرانہ احاطہ کالے صاحب سے بیر والے باغ نزد نہر سعادت خان چلا گیا۔ اور ترک وطن تک وہیں مقیم رہا۔

دینی تعلیم آپ نے محلہ کی درسگاہ سے حاصل کی اور مروجہ اُردو انگریزی، ہندی، حساب کتاب کی تعلیم گھر پر ایک لائق استاد سے حاصل کی۔ سفید کرتہ، پائجامہ اور جناح کیپ کے ساتھ بارعب مختصر داڑھی، دراز قد، مسکراتا ہوا چہرہ ان کا مستقل حلیہ ہے۔ بلا کی یادداشت رکھتے ہیں طبیعت میں آرام پسندی کا کوئی عنصر موجود نہیں۔ انکساری و شفقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ تبلیغی اجتماعات میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں۔ دل کے فیاض اور اللہ کے عبادت گذار بندے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ صائم الدہر اور قائم الیل ہیں۔ اصلاح معاشرہ کے داعی ہیں خدمت برادری ان کا شعار ہے۔ فرصت کا تمام وقت بجائے آرام کے دکھی انسانیت کی خدمت میں صرف کرتے ہیں۔

جمعیت پنجابی سوداگران (دہلی) کے مرکزی ادارہ کی مجلس منتظمہ کے فعال ممبران میں شامل ہیں۔ دہلی کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ غلام جیلانی والے کے نام سے مشہور ہیں۔ راقم الحروف سے تعارف جمعیت ہسپتال واقع دہلی کالونی، موسومہ۔ بی۔ ایچ۔ وائی کے ناظم کی حیثیت سے ہوا۔ حسن انتظام دیکھ کر دل خوش ہوا۔

بحیثیت کسٹم ایجنٹ۔ کلرنگ فارورڈنگ کام کرنے کے علاوہ ادویات، اور سوت کا کاروبار علیحدہ ہے۔ بہت خلیق، ملنسار اور ہنس مکھ انسان ہیں۔

موصوف نے دہلی کالونی میں ایک مدرسہ تعلیم القرآن قائم کیا ہے۔ اسے جس میں تقریباً ۴۵۰/۵۰۰ سو لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ مدرسہ کے کل اخراجات شیخ خلیل الرحمٰن اپنی جیب خاص سے کرتے ہیں۔

شیخ محمد الیاس صاحب لاہور والے

آپ مرحوم شیخ مشتاق احمد صاحب لاہور والوں کے صاحبزادے شیخ حاجی اللہ دیا مرحوم کے پوتے، منشی احسان الٰہی صاحب مرحوم المعروف منشی محمود والے کے نواسے، اور شیخ حافظ محمد سعید صاحب مرحوم سائیکل والوں کے داماد ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل دہلی کے بازار چاندنی چوک اور لاہور کے بازار نیلا گنبد پر واقع دکانوں کے علاوہ موروثی جائیداد آپکا ذریعہ معاش تھا۔ کاروباری ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی اور جائیداد سے ہونے والی کرایہ کی یافت کے سبب آپ کا خاندان متمول خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ دینی تعلیم آپ نے محلہ کی مسجد میں حاصل کی۔ اردو لکھنا پڑھنا اور اسی کے ساتھ ضروری حساب کتاب رکھنا آپ نے اپنے نانا مرحوم سے سیکھا۔

تقسیم ہند کے بعد بہت سے دوسرے اہل برادری کی طرح آپ بھی بے سروسامانی کی حالت میں براہ لاہور کراچی پہنچے۔ اور اپنی مدد آپ کے زریں اصول کو اپناتے ہوئے کراچی میں اہل برادری کی اولین بستی، دہلی کالونی (واقع چودھری خلیق الزماں روڈ) میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کیا جو مختلف اضافوں کے بعد اب ایک عظیم بلڈنگ میں تبدیل ہو گیا ہے موصوف تادم تحریر اسی میں مقیم ہیں۔

معاشی مسائل کو حل کرنے کے لئے ابتداً کچھ عرصہ تک آپ نے ملازمت

کی۔ بعدہٗ ملازمت ترک کر کے دلالی، بروکری کو ذریعہ معاش بنایا۔ اللہ نے حرکت میں برکت دی اور آپ نے سرائے روڈ پر ایک بوسیدہ بلڈنگ میں اپنا دفتر قائم کر کے درآمدی (IMPORT) کاروبار شروع کر دیا۔ کاروبار تاہنوز جاری ہے۔ مگر دفتر بوجہ انہدام عمارت برائے تعمیر نو دہلی کالونی میں عارضی طور پر منتقل کیا ہوا ہے۔

اگرچہ موصوف خود عالم نہیں ہیں۔ مگر علم دوست اور علماء کے قدردان ہیں۔ دینی کاموں خاص کر تبلیغی اجتماعات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اپنے جذبہ خدمتِ برادری (جو بچپن سے ہی آپ کے دل میں موجزن ہے) کی تسکین کے لئے کافی عرصہ تک خاموش خدمت گذار کی طرح اہل محلہ کی خدمت کرتے رہے۔ مگر جب اہل محلہ نے آپ کی سماجی کارگذاریوں سے متاثر ہو کر آپ کو محلہ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ تو دور و نزدیک آپ کا چرچا ہونے لگا۔

۱۹۷۱ء میں کچھ مردم شناس لوگوں نے برادری کے ایک قدیمی ادارہ جمعیت پنجابی سوداگران (دہلی) رجسٹرڈ، کراچی کی مجلس منتظمہ کے لئے آپ کا نام برائے انتخاب پیش کیا۔ عوام کی بھاری اکثریت نے اپنا ووٹ آپ کے حق میں استعمال کیا۔ اور آپ کامیاب قرار پائے اس طرح پہلی بار آپ مجلس منتظمہ کے ممبر بنے۔

مجلس منتظمہ کے جوہر شناس ممبران نے آپکی کارکردگی سے مطمئن ہو کر کئی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کیں۔ جن کو آپ نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ آجکل بھی آپ جمعیت پنجابی سوداگران دہلی کی مجلس منتظمہ کے فعال ممبران میں شامل ہیں اور جمعیت ہسپتال واقع دہلی کالونی موسومہ پی، ایچ، وائی کے نائب ناظم ہیں۔

موصوف محنت کش، متشرع، حق گو اور بے باک آدمی ہیں۔

(۱۹۳۵ء میں آپ دہلی کے ایک مشہور و معروف محلہ حویلی حسام الدین حیدر کی گلی گنوخانہ میں پیدا ہوئے۔ ——— اعجاز الرحمٰن شمسی

کچھ اپنے متعلق

میں حاجی محمد یوسف[1] (مرحوم) کھلونے والوں کا بیٹا، شیخ عبدالوہاب[2] مرحوم شیشہ والوں کا پوتا، حافظ احمد دین[3] مرحوم چھتری والوں کا نواسہ، منشی محمد حامد[4] گلاس ویر والے مرحوم کا داماد ہوں۔ ۱۹۲۲ء کو بمقام باغیچی اِسری پرشاد المعروف چھوٹی باغیچی علاقہ باڑہ ہندو راؤ دہلی اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوا۔ میں اپنے تمام بہن بھائیوں میں بڑا ہوں۔ میری پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہمارا گھرانہ چھوٹی باغیچی سے باغیچی اچھے جی منتقل ہو گیا۔ اور پھر کافی عرصہ وہاں مقیم رہنے کے بعد محلہ کوٹھی میم والی میں چلا گیا۔ اور ۱۹۴۷ء یعنی قیام پاکستان تک وہیں اقامت گزیں رہا۔ اِسی سال میں جس وقت جناب حاجی محمد صدیق صاحب باڑی، کوٹھی میم والی کے میر محلہ تھے میں اِسی جگہ سے عازم پاکستان ہوا۔

ہم جملہ پانچ بہنوں اور تین بھائیوں میں سے ایک بہن اور ایک بھائی اب سے تیس اور بیس سال پہلے یعنی والدین کی وفات سے پیشتر ہی

حاشیہ: ۱ء، دکان صدر بازار گلی مٹکوں والی میں تھی۔

۲ء:۔ یہ عبدالرزاق مرحوم شیشہ والوں کے (جن کے نام سے رہائشی مکانوں کا ایک چھتہ دہلی میں موجود ہے) برادرِ اصغر تھے۔ ۳ء:۔ ابتداء میں ان کا کاروبار ہندوستان کے ایک صحت افزا مقام ڈلہوزی پر تھا بعد میں ضیاء الرحمن چھتری والوں کے سیلز منیجر مقرر ہوئے۔ ۴ء:۔ یہ نواب عابد کے بھائی تھے۔ اور کورونیشن ہوٹل کے نیچے ان کی دکان تھی۔

اللہ کو پیارے ہو گئے اور اب ہم دو بھائی اور چار بہنیں بقید حیات ہیں۔ حاجی محمد یونس صاحب چوبھائی، رشید احمد صاحب ریشم والے، سلطان احمد صاحب موتی والے، اور محمد لیٰسین صاحب فاروقی علی الترتیب میرے بہنوئی ہیں۔ میری چھ اولادوں میں دو ذکور اور چار اناث ہیں۔ نواب الٰہی صابن والے، فیروزالدین رنگ والے، محمد احمد چوبھائی، محمد تقی جھلانے چاروں میرے داماد ہیں اور اعجاز الرحمٰن و عزیز الرحمٰن (شاہد) دونوں میرے فرزند ہیں۔

حاجی محمد لیٰسین صاحب کھلونے والے میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان کی چھ بیٹیاں اور پانچ بیٹے ہیں۔ محمد کامل، محمد فاضل، محمد سمیع (جاوید)، محمد اسلم، اور حافظ محمد انور ان کے فرزند میرے بھتیجے ہیں۔ محمد وسیم اور پانچ لڑکیاں میرے مرحوم بھائی محمد امین کی اور ایک لڑکی میری مرحومہ بہن کی نشانی ہے۔

مجھے اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی عار نہیں کہ تعلیم کے علاوہ مالی اعتبار سے بھی مجھے کبھی کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ دینی تعلیم میں نے محلہ کی ایک چھوٹی سی درسگاہ "چھوٹے قاری جی کا مدرسہ" سے حاصل کی یہ درسگاہ باغیچی اچھے جی کے پھاٹک کے باہر واقع تھی اور اس کے لائق و فائق استاد قاری احمد حسین صاحب مرحوم کا طریقہ تعلیم اور شاگردوں کے ساتھ رویہ بہت اچھا تھا۔

مجھے اپنے ہم سبق ساتھیوں کے علاوہ دراز قامت، ماموں چنے والے بطور خاص اس لئے یاد ہیں کہ وہ دمڑی (ایک سکّہ جو اس وقت ایک روپیہ کا دو سو چھپنواں حصّہ ہوتا تھا) میں روزانہ گرماگرم بھنے ہوئے چنوں اور کھیلوں کی اتنی مقدار دیدیتے تھے کہ اُن سے میں اور میرے دو دوسرے دوست

بآسانی ناشتہ کر لیتے تھے۔ بھوک میں بھُنے ہوئے چنوں کی سوندی سوندی خوشبو کتنی فرحت بخش اور دل آویز ہوتی ہے۔ یہ بات ان سے لطف اندوز ہونے والے بخوبی جانتے ہیں۔

دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پرائمری، ابتدائی تعلیم میں نے پنجابی اسلامیہ اسکول قطب روڈ (سموسہ پر بنی ہوئی موجودہ نئی عمارت سے پہلے پرانی عمارت نزد جارج بلڈنگ) جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی شاخ بارہ ٹوٹی اور میونسپل اسکول نزد پل بنگش سے حاصل کی۔ اگرچہ میرے اساتذہ کرام کی فہرست بہت طویل ہے مگر جنہوں نے مجھے مہمیز کیا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ جناب محمد صدیق صاحب ایم، ماسٹر احمد دین، لالہ رام سروپ، لالہ دین دیال، عباس مرزا، اور محترم جناب عبد الوکیل خطیب۔

آنجہانی جارج پنجم قیصر ہند کی سلور جوبلی پر منائی جانے والی تقریبات میونسپل کمیٹی دہلی کی جانب سے تقسیم شدہ طشتریاں جن پر شاہ اور ملکہ کی تصاویر بنی ہوئی تھیں معہ مٹھائی اور ایک ایک پیسہ مالیت کے ٹوکہ کوپن مجھے اب بھی یاد آکر محظوظ کرتے رہتے ہیں۔

پرائمری تعلیم حاصل کرنے کے بعد ثانوی تعلیم کے لیے میں فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ اور ہر سال ہر مضمون میں معقول نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے ہوئے بالآخر میٹرک میں پہنچ گیا ؎

ٹوٹی کہاں کمند۔ دو ہاتھ لب بام رہ گیا۔

شومیِ قسمت میٹرک میں داخلہ حاصل کئے ہوئے ابھی تین ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ دکان کے ملازمین نے جو پہلے بھی قبلہ والد صاحب مرحوم کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ کچھ زیادہ ہی پریشان کرنا شروع کر دیا روزانہ دیر

سے کام پر آنا۔ سبب بے سبب غیر حاضر رہنا۔ کام سے غفلت اور تاخیر ان کا معمول بن گیا۔ چنانچہ صورتحال پر قابو پانے کے لئے مجھے مرحوم والد صاحب کی ہدایت پر تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔ اور باوجود کوشش کے اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوتے ہی گرانی اور پریشانی روز بروز ترقی کرنے لگی۔ اشیا کی قیمتیں زمین سے آسمان پر پہنچ گئیں۔ دساور (یورپ) سے مال کی آمد میں خلل واقع ہونے لگا۔ تجارت محدود ہوتی رہی اور جنگی سامان کی سپلائی بڑھتی رہی۔ اسی دوران میری شادی ہوگئی اور میں نے گلی مٹکوں والی کے سامنے سرائے اسحٰق اللہ والی میں پوسٹ آفس کے نیچے نانک چند دیوان چند کے سامنے ایک چھوٹی سی الماری میں اپنے ذاتی کاروبار کی بنا ڈالی

حکومت نے قیمتوں کو ایک خاص سطح پر برقرار رکھنے کے لئے پرائس کنٹرول کے احکامات جاری کئے اور احکامات کی بجاآوری کے لئے مسٹر شرما کو انسپکٹر اور جناب عبدالرشید صاحب کو مجسٹریٹ بکار خاص مقرر کیا۔ نتیجتاً ایک طرف کاروباری آزادی سلب ہوئی اور دوسری جانب چور بازاری ہونے لگی۔

بالآخر عالمی جنگ اپنے اختتام کو پہنچی اور جنگ آزادی ہند نے زور پکڑا۔ تحریک پاکستان اس جنگ کا ایک نمایاں اور اہم جز تھا۔ جو قیام پاکستان پر منتج ہوا۔ اعلان پاکستان کے بعد جن لوگوں نے پاکستان روانہ ہونے کی تیاریاں شروع کیں۔ میں بھی انہی میں شامل تھا۔ مختصر یہ کہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ دہلی سے بذریعہ طیارہ راولپنڈی پہنچا تقریباً

ڈیڑھ سال بعد وہاں سے کراچی روانہ ہوگیا۔ کراچی پہنچ کر میں نے جو کیا۔

؎ میں خود کہوں تو میری داستاں دراز ہے نہیں۔

اپنے وسائل سے میریٹ روڈ لولٹن مارکیٹ پر ایک چھوٹی سی دکان کاروبار کے لئے اور وسط شہر آرام باغ پر ایک متوسط درجہ کا فلیٹ قیام کے لئے حاصل کیا۔

وہی دکان آج بھی میرا ذریعہ معاش ہے اور وہی فلیٹ میری جنت ارضی ہے فرق صرف یہ ہوا ہے کہ پہلے میں خود کام کرتا تھا۔ اب میرے بچے کام کرتے ہیں اور میں بقول انشاء مرحوم ؎

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

جہاں تک سماجی رفاہی فلاحی کاموں کا تعلق ہے میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں، حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

شیخ عبدالستار صاحب بابن والے

آپ عبدالحمید صاحب مرحوم بابن والوں کے بیٹے۔ عبدالرزاق بابن والوں کے پوتے، عبدالمجید بابن والوں کے بھائی۔ جناب شیخ محمد ابراہیم صاحب لوہے والوں کے نواسے اور جناب عبدالجبار صاحب بیڑی والوں کے داماد ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں بمقام شہر دہلی محلہ لال کنواں گلی چابک سواران پیدا ہوئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ اپنے والدین کے ہمراہ پھاٹک حبش خان چلے گئے اور یہاں مسجد ایک برج والی میں قرآنی و دیگر دینی تعلیمات حاصل کر کے آٹھ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۳۶ء ابتدائی تعلیم کے لئے پنجابی اسلامیہ اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں چھٹی جماعت سے فارغ ہو کر اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے کارخانہ چلے گئے

(نوٹ:۔ ان دنوں پنجابی اسلامیہ اسکول صرف چھ جماعتوں پر مشتمل تھا) بعدہٗ نقل مکانی کر کے آپ کا خاندان محلہ فیاض گنج چلا آیا اور ترک وطن تک وہیں مقیم رہا۔

۱۹۴۸ء میں ترک وطن کر کے آپ کراچی پہنچے۔ اور اپنا آبائی کاروبار بابن کا کارخانہ نشتر روڈ پر قائم کیا جس کو خرابی صحت کی بناء پر مکمل طور پر باقاعدگی سے نہ چلا سکے اور بالآخر بند کرنا پڑا۔ فی الوقت بھی یہ کارخانہ کیل کانٹے سے لیس بند پڑا ہوا ہے موصوف کی سات اولاد میں سے پانچ ذکور اور دو اناث ہیں۔ لڑکیاں امور خانہ داری

وتعلیمات اسلامی سے بہرہ مند اور شادی شدہ ہیں۔ لڑکے دینی و دنیوی علوم میں اچھی خاصی دسترس رکھتے ہیں۔ اور کیونکہ جدی تاجر ہیں اس لئے ان کی طبیعت مائل بہ تجارت ہے ان کی گوت بابن والے کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے دادا مرحوم یہ صنعت جرمنی سے عملی طور پر سیکھ کر مشینری کے ساتھ واپس آئے۔ اور انہوں نے برصغیر ہند و پاک میں سب سے پہلے اس صنعت کو متعارف کرایا۔

شیخ ممتاز الدین چوتھائی

آپ حاجی جمال الدین مرحوم چوتھائی[1] کے فرزند ارجمند۔ حاجی قمرالدین مرحوم چوتھائی کے پوتے اور حاجی کرم الٰہی مرحوم اجمیر والوں کے نواسہ ہیں۔ ستمبر ۱۹۱۴ء کو شہر دہلی کے ایک مشہور و معروف محلہ کشن گنج میں واقع اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔

موصوف نے اپنی تعلیم کا آغاز محلہ کی ایک دینی درسگاہ مدرسہ علوم دینیہ میں قرآنی تعلیمات سے کیا۔ اپنی خداداد صلاحیت اُستاد کی اعلےٰ قابلیت اور والدین کی پوری توجہ کی بدولت جلد ہی دینی تعلیمات مکمل کرکے مروّجہ ابتدائی تعلیم کے لئے پنجابی اسلامیہ مڈل اسکول واقع قطب روڈ میں داخلہ لیا۔ اور وہاں سے مڈل درجہ کی تعلیم سے فارغ ہوکر[2] اپنے والد کی دکان۔ ایس جمال الدین اینڈ سنز (جو دہلی کے ایک مرکز تجارت صدر بازار کے قلب میں واقع سرائے حافظ بنہ میں تھی) پہنچے۔ اور ربساطخانہ کے کاروبار سے وابستہ ہو گئے۔

زندگی کی بائیس منزلیں طے کر لینے کے بعد آپ نے شیخ عطاء اللہ مرحوم

حاشیہ :۔ ۱۔ قیام پاکستان سے پہلے حاجی جمال الدین چودھری کے نام سے معروف تھے۔ اس امر کے گواہ آج بھی کراچی میں موجود ہیں کہ آپکو انگریزی عدالتوں کی جانب سے ثالث مقرر کیا جاتا تھا۔

۲۔ اس زمانہ میں پنجابی اسلامیہ اسکول کی تعلیم مڈل درجہ تک محدود تھی۔

بٹلہ کلکتہ والوں سے شرف دامادی حاصل کیا اور ۲۴ فروری ۱۹۳۶ء بروز منگل اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا۔ محمد یحییٰ، محمد کامل، کامران، ممتاز، اختر ممتاز علی الترتیب آپ کے بیٹے اور شیخ نجم العارفین گھڑی والے آپکے داماد ہیں۔

۱۹۴۷ء میں آپ ترک مکانی کرکے کراچی پہنچے اور اپنے وسائل کو بروکار لاکر کراچی کے مشہور کاروباری علاقہ بولٹن مارکیٹ پر ایک دکان اور رہائشی علاقہ برنس روڈ پر ایک متوسط درجہ کا فلیٹ حاصل کیا۔ اگرچہ موصوف کا کاروبار آسی دکان پر ایس ممتاز الدین اینڈ سنز کے نام سے جاری ہے[1] مگر رہائش دھلی مرکنٹائل ہاؤسنگ سوسائٹی میں اپنی ذاتی تعمیر شدہ بنگلہ میں ہے

موصوف اپنے والد ماجد کی طرح دینی معاملات میں کافی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور انہی کی طرح ہر خواہش مند، اہل برادری کے معاشرتی اور عائلی مسائل نہایت خندہ پیشانی سے سنتے اور نہایت تدبر سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہایت خلیق، ملنسار، اور باغ و بہار طبیعت کے مالک ہیں مستجاب الدعوات لوگوں میں سے ہیں۔

واقعات شاہد ہیں کہ درد شکم کے جتنے بھی مریضوں کا علاج آپ نے بذریعہ دعا کیا ان میں سے اسّی فیصد شفایاب ہو گئے۔

حاشیہ [1]۔ دکان پر کاروبار بساطخانہ کا ہوتا ہے۔

جناب محترم شیخ عطاء الرحمٰن شمسی صاحب کھلونے والے کی تحریر کردہ کتاب "دلی کے پنجابی سوداگراں" میں نے جستہ جستہ پڑھی جناب شیخ عطاء الرحمٰن شمسی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے پنجابی برادری کی تاریخ کو خلوص کے ساتھ قلم بند کیا۔ یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے جس پر برادری کے علاوہ پاک و ہند کے تمام اہل زبان و اہل علم حضرات کو فخر ہونا چاہیئے۔ پنجابی برادری کے علاوہ یہ کتاب اہل علم کے لئے ایک قیمتی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں جہاں پنجابی برادری کے روشن اور نمایاں پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں، وہاں مصنف نے نئے گوشوں پر بھی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ جو نئی نسل کے لئے مینارۂ روشنی کی حیثیت رکھتی ہے۔

توصیف چغتائی

ممتاز افسانہ نگار و ماہر تعلیم

حرفِ چند

یہ بات انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے حالات و کوائف معلوم کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے اس سے جہاں اس کی جبلت تجسس کی تسکین ہوتی ہے وہیں ماضی سے اس کا رشتہ قائم ہو کر مستقبل کے لئے بھی راہ متعین ہو جاتی ہے۔ وہ اُن روایات کو جو اس کو اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہیں سامنے رکھ کر اپنے لئے لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔ اچھی روایات کو جاری رکھ کر مستقبل کو کامیاب بناتا ہے اور بُری روایات سے اجتناب برت کر ان بُرے نتائج سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے بزرگوں کو بھگتنے پڑے ہے۔

محترم شیخ عطاء الرحمٰن صاحب شمسی نے اس نکتہ کو ذہن میں رکھ کر اپنے اسلاف کی اصل نسل، ان کے قومی خصائص اور رسوم و رواج کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور روایات کو کام میں لانے کے ساتھ ساتھ مستند تاریخی کتب سے بھی پوری مدد لی ہے۔ اس طرح دہلی کے پنجابی سوداگران کا یہ تذکرہ مرتب ہو گیا ہے۔

کسی فرد یا قوم کی تعمیر و ترقی میں جغرافیائی عوامل کا کافی عمل دخل ہوتا ہے اور اگر ان عوامل کو نظر انداز کر دیا جائے تو فرد یا قوم کی مخصوص صفات یا مخصوص حالات کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاریخِ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو

یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی قوم بھی اپنے ماحول اور جغرافیائی عوامل سے غیر متاثر نہیں رہی بلکہ جس طرح کے جغرافیائی حالات ہوئے اسی طرح کی قوم وجود میں آئی اور افراد قوم نے اسی کے مطابق مشاغل اور پیشے اختیار کئے چنانچہ انگلستان اور ناروے کے باشندے سمندروں سے گھرے ہونے کے سبب جہاز راں بن گئے اور سندھ گنگا کے میدان کے رہنے والے ہموار اور زرخیز زمین اور آب رسانی کے ذرائع میسر ہونے کی وجہ سے زراعت کو اپنا پیشہ بنانے پر مجبور ہوئے۔ مکہ معظمہ ایک غیر ذی زرع علاقہ میں واقع ہونے کے سبب تجارت کا مرکز بنا اور مدینہ کے باشندے وہاں کی قابل زراعت زمین ہونے کی وجہ سے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کرنے کی طرف مائل ہوئے۔

چونکہ دلی کے پنجابی سوداگران کا مخصوص پیشہ تجارت ہے اس لئے مصنف موصوف نے ضروری سمجھا کہ اس ماحول اور ان حالات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے جنہوں نے ان لوگوں کو تجارت کا پیشہ اختیار کرنے کی جانب مائل کیا۔ روایات اور تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی آنے سے پہلے یہ قوم پنجاب کے اس علاقہ میں رہتی تھی جو پنجند کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ماضی میں اس علاقہ میں دریائی گزرگاہوں کے سبب رسل و رسائل اور نقل و حمل کی سہولتیں میسر تھیں اس لئے تجارت کا پیشہ سب سے زیادہ منفعت بخش تھا۔ قدرتی طور پر یہاں تاجروں کی ایک قوم وجود میں آئی اور یہ پیشہ اس قوم کی امتیازی خصوصیت بن گیا بعد میں یہی قوم پنجابی سوداگران کہلائی۔

مصنف موصوف نے اس تحقیق کے ساتھ یہ بھی انکشاف کیا ہے۔

کہ پنجابی سوداگران نسلاً آریہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے وہ بت پرست تھے لیکن برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد انہوں نے بعض اولیاء اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اور اپنے عقائد میں اس درجہ پختگی حاصل کی کہ اب بھی یہ لوگ شرع شریعت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور اسلامی شریعت پر عامل ہیں۔

مصنف کی تحقیق کے بموجب یہ لوگ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں دہلی آئے اور وہاں انہوں نے تجارت کو اپنے ہاتھ میں لیکر جلد ہی ایک مخصوص مقام حاصل کر لیا۔ مختلف خاندانوں نے مختلف صنعتوں اور مختلف اشیاء کی تجارت کو اپنایا اور اس طرح وہ صنعت و تجارت الگ الگ خاندانوں کے ساتھ مخصوص ہو گئی۔ اس چیز نے اس درجہ اہمیت حاصل کی کہ ہر فرد نے اپنی پہچان کے لئے اپنے نام کے ساتھ لفظ "والے" کے ساتھ اپنے ذریعہ معاش یا آبائی تجارتی نشان کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً "دوائی والے" "بابن والے" "سوت والے" "کھلونے والے ہیں" وغیرہ۔

دہلی میں وارد ہونے کے بعد پنجابی سوداگران ایک تجارتی بستی بنام منڈی کے محلہ کٹڑہ اور تجارتی بستی بنام منڈی کے محلہ کٹڑہ اور بستی پنجابیاں کلاں میں مقیم ہوئے بعدہٗ دوسرے حصوں میں پھیل گئے۔ مصنف نے یہ تفصیلات بیان کرنے کے بعد ان کے طرز رہائش، لباس، خوراک، زبان تعلیم اور رسوم و رواج پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ کس وقت انہوں نے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اسی کے ساتھ نہایت فاضلانہ انداز سے رسوم و رواج کی تاریخ بیان کر کے اس کے اچھے برے نتائج بتا دیئے ہیں۔ پھر اس وقت کے سیاسی حالات پر کسی قدر تفصیلی

بحث کر کے بتایا ہے کہ "منٹو مارلے اصلاحات مجریہ ۱۹۰۹ء سے فیضیاب ہونے کے لئے پنجابی سوداگراں کے کچھ بزرگوں نے برادری کو قوم کا درجہ دے کر اس کے لئے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام "انجمن وکیل قوم پنجابیاں" رکھا۔

اسی ضمن میں موصوف نے دہلی کی پوری تاریخ اور وہاں کے خاص خاص بازار، عمارتیں اور تاریخی مقامات کے حالات بیان کر دیئے ہیں اور یہ سب باتیں نہایت دلچسپ انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔ بعض عمارات کے فوٹو شامل کر دینے سے افادیت اور دلچسپی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے چوتھا باب تذکرۃ الرجال کے لئے مختص ہے۔

غرض پوری کتاب نہایت معلومات افزا اور بیحد دلچسپ ہے شیخ عطاء الرحمٰن صاحب نے اس قیمتی دستاویز کی تیاری میں جن ماخذات کو سامنے رکھا ہے ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی تحقیق اور کاوش سے یہ مواد جمع کیا ہے۔ اپنی اس کاوش و کوشش کے لئے وہ دہلی کے پنجابی سوداگران کی جانب سے شکریہ اور عام قارئین کی طرف سے تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

فجزاھم اللہ خیر الجزاء

ثناء الحق صدیقی
ریسرچ اسکالر
انجمن ترقی اردو ادارہ
پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

"ایک اہم تاریخی وتحقیقی کتاب"

از : راشد اسدی ایم ۔ اے ، بی ایڈ

پچھلے دنوں توقیر صدیقی صاحب کے پاس " دلی کے پنجابی سوداگران
ایک تاریخی جائزہ " نامی کتاب کا مسودہ دیکھا جس کے شروع میں توقیر
صدیقی صاحب کا مقدمہ پڑھ کر اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور تجسس
پیدا ہوا کہ اس کتاب کو مزید پڑھا جائے اسلئے کہ اس مقدمہ میں کتاب
نہایت عالمانہ انداز میں تاریخ وجغرافیہ کے اصولوں کے مطابق جائزہ
لے کر اس کتاب کی اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے اور اس بات کا اعتراف
کیا ہے کہ واقعی عطاء الرحمٰن صاحب نے اس کتاب کے موضوع
کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اپنا حقِ تحقیق ادا کر دیا ہے ۔

اس کتاب کے نام سے ایک سوال عمومی طور پر ابھر کر سامنے آسکتا ہے
کہ اس کتاب کو لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی لہٰذا اس سوال کا جواب خود
عطاء الرحمٰن صاحب نے اپنے پیش لفظ میں یہ دیا ہے کہ وہ فرد ، افراد یا
برادری وقوم جو ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے اس کی مثال ایک معلق شے
کی مانند ہوتی ہے جو خلا میں ڈولتا رہتی ہے لیکن اسکی کوئی ٹھوس بنیاد و
اساس نہیں ہوتی اس لئے اپنے ماضی اور اسلاف کے بارے میں پوری

واقفیت رکھنا ضروری ہے ۔ پھر اسی دوران عطاء الرحمٰن صاحب کی
نظر سے حضرت ابوبکر صدیق رض کا یہ قول بھی ترمذی شریف میں مندرجہ
گزرا کہ ـــــ

" اپنا حسب ونسب چھپانے یا اس میں فرق کرنے والا اللہ تعالےٰ
سے کفر کرتا ہے ۔"

چنانچہ اس برادری کے رکن ہونے کے ناطے سے انھوں نے ضروری
سمجھا کہ اس برادری کی تاریخ اور اسلاف کے بارے میں تحقیقی کام کریں
گو ان سے قبل بعض انجمنوں اور بعض افراد نے اس طرف توجہ دی تھی لیکن
یہ کام محض رسمی کارروائی سے آگے نہ بڑھ سکا لہٰذا عطاء الرحمٰن صاحب نے
ذاتی طور پر تحقیقی کام کی تکمیل کی طرف توجہ دی اور یہ تحقیق وتفتیش کا سلسلہ
۶ سال تک جاری رہا تب جاکر وہ اس مرحلہ پر پہنچے کہ اپنی تحقیق کو کتابی
شکل میں پیش کرسکیں ۔

یہ کتاب ۴ ابواب ، ایک پیش لفظ اور ایک مقدمہ پر مشتمل ہے پیش
لفظ میں عطاء الرحمٰن صاحب نے اپنی تحقیق کی روشنی میں پنجابی سوداگران کی
تعریف کی اور تاریخ پیش کی ہے جو مختصر اور جامع ہے ـــ وہ اس کام
میں کامیابی سے ہمکنار رہتے ہیں اور قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نہایت
محنت اور تحقیق کے بعد ایسی کتاب تحریر کی جو ایک طرف تحقیق وتاریخی
اہمیت کی حامل ہے اور جس سے ایک طرف تو اس صدیوں کی دھندلکوں میں
گم ہوجانے والے اس دور کی تاریخی اہمیت واضح ہوتی ہے تو دوسری
طرف اس سے تاریخ ملت کے ایک اہم گوشہ پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس
قسم کے تذکرے اور تاریخی کتابیں ترتیب دینا محنت طلب ہی نہیں بلکہ بڑا

صبر آزما کام ہوتا ہے جس کا تھوڑا سا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے تذکرہ سخنوران جے پور کی ترتیب کا کام شروع کیا (جو ابھی جاری ہے) عطاء الرحمن صاحب کی یہ کتاب مستند تاریخ ثابت ہوگی اس لئے کہ انھوں نے روایات کو درایت کی کسوٹی پر کسا ہے اور ۵۸ ، ۵۹ کتابوں سے مستند حوالے اور اپنی کتاب کا مواد اخذ کیا ہے اور پھر ان کا اسلوب عام فہم اور دلچسپ ہے چنانچہ یہ کتاب صرف اس مخصوص برادری کے افراد ہی میں نہیں بلکہ عام قاری کے لئے بھی مفید، دلچسپ اور پر از معلومات ثابت ہوگی ۔

راشد اسدی
۲۹/۶/۸۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب "دہلی کے پنجابی سوداگران"
(ایک تاریخی جائزہ)

میری نظر میں!

یوں تو میرا براہ راست تعلق شعبہ سائنس سے ہے اور روزانہ اسی شعبہ کے طلباء سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن ابتدا ہی سے علم و ادب اور سوانح و تاریخ سے دلچسپی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ میں اپنے روزمرہ کے معمولات کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی محفلوں میں شرکت کرتا رہتا ہوں اور علمی و ادبی موضوع پر کتب بینی بھی میرا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ پچھلے دنوں توقیر صاحب کی وساطت سے کتاب " دہلی کے پنجابی سوداگران ایک تاریخی جائزہ " کے مسودہ کا جستہ جستہ مطالعہ کا موقع ملا۔ یوں تو یہ کتاب ایک برادری کا تاریخی جائزہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ —— عطاء الرحمن صاحب نے نہایت محنت سے ہماری تاریخ کے اُن گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جو ہماری تاریخ کا اہم جزو ہیں اور جو ابھی تک عام نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ یوں تو یہ ایک مخصوص برادری کا تذکرہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرتب کے اس تذکرہ کو اپنی علمی

وادبی بصیرت سے عام قاری کے لئے ایک دلچسپ کتاب بنادی ہے جس میں فن تاریخ نگاری کے لوازمات بھی موجود ہیں ۔ اور ادب کی چاشنی بھی اور پھر اس میں بعض ایسی شخصیات کا تذکرہ بھی ہے ۔ جو ہماری علمی و تہذیبی تاریخ کا اہم موضوع ہیں ۔ غرض کہ اس کتاب کے ذریعہ عطاء الرحمٰن صاحب نے جہاں اپنی برادری کے کارناموں سے عوام کو روشناس کرایا ہے ۔ وہیں انھوں نے اس بات کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے کہ ہمیں ایسی برادریوں کے حالات کو یکجا کرکے اپنی ملی تاریخ کے ان گوشوں کو اجاگر کرنا چاہیئے جو ابھی تک عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں ۔ امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف اپنی برادری کے افراد میں مقبول ہوگی بلکہ عام قاری کے لئے بھی ایک دلچسپ اور پراز معلومات کتاب ثابت ہوگی اور عطاء الرحمٰن صاحب کی محنت رائےگاں نہیں جائیگی ۔

شیخ علی الدین
(شعبۂ نباتیات)
گورنمنٹ ڈگری سائنس کالج
لانڈھی، کورنگی
کراچی

مورخہ ۲۶ جون ۱۹۸۵ء

اظہارِ حقیقت و اعترافِ حقیقت

از

عارف دہلوی ایم۔ اے
جنرل سیکریٹری جمعیت برادرانِ دھلی رجسٹرڈ
ٹرسٹی ۔ ایجوکیشنل اینڈ میڈیکل ٹرسٹ
ایڈیٹر ۔ ماہنامہ "الاشرف" کراچی
نگرانِ اعلیٰ ۔ اسلامک مشن انٹرنیشنل کراچی

محترم شمیم صاحب (پین والے) کی عنایت کہ جناب عطاء الرحمٰن (کھلونے والے) کی تالیف "دلی کے پنجابی سوداگران ۔ ایک تاریخی جائزہ" دیکھنے کو ملی ۔ یہ مسودہ کی شکل میں ہے گویا ابھی اشاعت کا مرحلہ نہیں آیا ہے مجھے اس کتاب پر اظہارِ خیال کے لیے نہیں کہا گیا لیکن میں پھر بھی اپنی رائے سینۂ قرطاس پر منتقل کررہا ہوں ۔ جب کہ خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس طرح بن بلائے مہمان کی وقعت نہیں ہوتی اسی طرح بن کہے تبصرہ کرنے والے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا تبصرہ قابلِ غور سمجھا جاتا ہے ۔ یہ سب کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود مختصراً میرا تبصرہ یہ ہے

"عطاء الرحمٰن صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وقت کی اہم ضرورت کو بطریقِ احسن پورا کیا ۔ تاریخی حقائق کو تلاش کرنا اور پھر سلیقے سے ترتیب دینا نہایت عرق ریزی اور دیدہ دری کا کام ہے میں اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہوں گا ۔ اس لیے کہ جناب سرور احمد توقیر صدیقی صاحب نے اس کتاب کا مقدمہ لکھ کر تاریخ نگاری اور

مورخ کی خوبیوں پر سیر حاصل تبصرہ کر دیا ہے۔ بلا شبہ ایسے مقدمے کی ضرورت تھی۔ توقیر صدیقی صاحب کا مقدمہ اس اہم کتاب کی مانگ کا سیندور ہے۔

مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ مولف نے جس محنت اور لگن سے یہ کتاب لکھی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ پرنٹنگ اور کتابت کی تمام خوبیوں کے ساتھ اس کتاب کو منظرِ عام پر آنا چاہیے۔

دلّی کے پنجابی سوداگران کے تاریخی جائزے کے ضمن میں برصغیر بالخصوص پنجاب کا تاریخی جائزہ جس خوبی سے پیش کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے بھی یہ کتاب نہایت قدر و قیمت کی حامل ہو گئی ہے۔

اس کتاب کو جلد از جلد منظرِ عام پر آنا چاہیے۔ بلا جھجک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب صرف دِلّی کے پنجابی سوداگران ہی کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کی ضرورت ثابت ہوگی۔

(نوٹ) محترم عارف دہلوی صاحب نے جس فراخدلی، خلوص اور علم دوستی کا مظاہرہ کیا ہم اس کے لیے بہت ممنون ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ موصوف کی تجاویز سے بھی استفادہ کر لیا گیا ہے اس کا شکریہ قبول فرمائیں۔

اللہ تعالٰے نے قرآن مجید کی سورۃ حجرات میں ارشاد فرمایا ہے کہ

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف علاقوں، قبائل اور گروہ میں صرف اس لئے کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ وہ معزز ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے"۔

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالٰے نے انسانوں کو جو مختلف ذاتوں اور علاقوں میں پیدا کیا ہے اس کا سبب صرف ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنا اور ایک دوسرے کی شناخت ہے ورنہ اللہ کے نزدیک عزت و شرف اور فخر و اعزاز کا دار و مدار تقویٰ پر ہے یعنی جو شخص اللہ کے احکام کا جتنا پابند ہو گا اتنا ہی اللہ کی نظر میں معزز اور پیارا ہو گا۔ لہٰذا ہمارے لئے فخر اور اعزاز کا سبب صرف اور صرف اسلام ہے البتہ ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرنے کے لئے مختلف برادریوں اور جماعتوں اور تنظیموں کی تقسیم مستحسن ہے کیونکہ اس سے ملک و ملت، قوم و مذہب کی خدمت میں جذبہ مسابقت پیدا ہوتا ہے۔

قوم و ملک و ملت، دین و مذہب کی خدمت میں جب برادریوں کا تذکرہ آتا ہے۔ تو اس تعلق سے "جمعیت پنجابی سوداگران دہلی" یا دلّی کے پنجابی سوداگران کا تذکرہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کیونکہ اس برادری نے تحریک پاکستان میں زیادہ خدمات انجام دی ہیں نیز قیام پاکستان سے قبل برصغیر کی سیاسی، سماجی اور معاشی خدمات

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور دینی خدمات جس طرح سے اس برادری نے انجام دی ہیں اور دے رہی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔

اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اس برادری کی کوئی جامع اور مبسوط تاریخ مرتب کی جاتی تاکہ اہل وطن اس برادری کی تاریخ اور خدمات سے آگاہ ہوں۔ اس سلسلہ میں کئی چھوٹی موٹی کتابیں اور مقالات لکھے گئے جو اپنی اپنی جگہ پر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ایک خاص کتاب کی ضرورت باقی تھی۔ جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب کھلونے والے نے اس کمی کو بہت حد تک پورا کر دیا ہے انہوں نے "دلی کے پنجابی سوداگران ایک تاریخی جائزہ" کے نام سے کتاب لکھ کر نہ صرف یہ کہ اس برادری بلکہ ملک وملت کی بھی خدمت انجام دی ہے۔

یہ کتاب جو چار ابواب پر مشتمل ہے نہ صرف یہ کہ یہ ایک برادری کی تاریخ ہے بلکہ اس کتاب کے مطالعہ سے مختلف برادریوں کے آغاز وارتقاء برصغیر کی سیاسی، سماجی تاریخ اور خاص طور پر دہلی کی تاریخ، دور بدور اسکے ارتقاء، دلی کے گلی، کوچے، محلے، بازار، عمارات، مساجد وغیرہ کا بھی تفصیلی ذکر آگیا ہے۔ انداز بیان نہایت سادہ اور دلنشین ہے اور جا بجا تاریخی حوالوں سے مدد لی گئی ہے۔ اور پھر دہلی کی خاص خاص عمارات کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔

شیخ عطاء الرحمٰن شمسی صاحب نے اس کتاب کے سلسلہ میں جو محنت کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اس کتاب کو حرف آخر تو نہیں

کہا جا سکتا البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اب تک دلی کے پنجابی سوداگران کی تاریخ پر جو کچھ لکھا گیا تھا یہ کتاب ان سب میں بہترین ہے مؤلف نے ان کتابوں کی فہرست بھی شامل کی ہے جن کے مطالعہ سے انہوں نے اس کتاب کی تیاری میں مدد لی ہے اس سے ان کے عمیق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

میں جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر ایک اہم خدمت انجام دی ہے جو قابل تعریف و ستائش ہے۔

پروفیسر محمد یامین محمدی
صدر شعبۂ قانون
وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔ کراچی

تقدیم

ہندوستان پاکستان کی تاریخ میں اگر کسی ایک ایسی برادری کا انتخاب مقصود ہو جس نے تاریخ کے علمی، ادبی، تعلیمی، اصلاحی، سیاسی اقتصادی میدانوں میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہوں تو قرعۂ فال دہلی کے پنجابی سوداگران کی جمیعت کے سوا کسی اور کے نام نہیں نکل سکتا اس برادری نے زندگی کے مختلف گوشوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں سے اس کے دامن کو مالا مال کر دیا ہو۔

اس برادری کی خدمات کے خاص دائرے تعلیم، سماجی اصلاح اور صحت رہے سیاسی خدمت کے میدان میں وہ بہت بعد میں آئی لیکن اس کی فیض بخشیوں سے یہ میدان بھی کچھ کم فیض یاب نہیں ہوا۔ تعلیمی خدمات کے میدان میں ابتدائی دینی مدارس سے لیکر اعلیٰ دینی درسگاہوں اور جدید تعلیم کے ادنی و اعلیٰ اداروں کا قیام نیز تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے تعلیمی وظائف کا اجراء، سماجی اصلاح کے سلسلے میں برادری میں خاص طور پر اور مسلمانوں میں عام طور پر غلط اور لایعنی رسموں کے خلاف ان کے خاتمے کی تحریک اور ضروری تقریبات میں کفایت شعاری کی دعوت اور صحت کے حصول کے لئے شفاخانوں اور ڈسپنسریوں کے قیام کی تحریک عورتوں اور بچوں کے لئے زچہ خانوں اور صحت کے مراکز کا قیام اس کی توجہ کا خاص مرکز رہا

ہے۔ یہ کام دو سطحوں پر انجام پائے ہیں۔

اولاً :۔ خود اپنے وسائل سے ہر طرح کے تعلیمی، اصلاحی اور صحت عامہ اور علاج معالجے کے ادارے قائم کرنا۔

ثانیاً :۔ اس قسم کے اداروں کے قیام میں بلا تفریق مذہب و ملت امداد دینا اور دوسروں کے ساتھ تعاون کرنا۔

اس قسم کے کام بعض دوسری برادریوں نے بھی انجام دیئے ہیں اور دیتی ہیں لیکن ان کا فیضان صرف ان کی برادری کے دائرے تک محدود رہتا ہے ان کے برعکس پنجابی سوداگران نے جو کام کئے ان میں اگرچہ انحصار انہوں نے اپنے ہی وسائل پر کیا لیکن ان کی فیض بخشیاں ان کی اپنی برادری کے خاص دائرے میں محدود نہیں رکھا، بلکہ نہ صرف مسلمانوں کے تمام طبقات کے لئے بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی اپنے اداروں کے دروازے کھلے رکھے۔ اپنی برادری کے قائم کردہ اداروں کے علاوہ اس برادری کی دولت سے برصغیر کے قدیم و جدید تعلیم کے اداروں، دینی و دنیاوی درسگاہوں، مساجد، رفاہ عامہ کے اداروں نے ہمیشہ فیض اٹھایا ہے۔

اس برادری کے لوگوں کی خاص توجہ تجارت کی طرف تھی، جس میں خدا تعالےٰ نے انسانی معیشت کا بیشتر حصہ رکھا ہے، اس لئے لازمی تھا کہ ان کے ذوق و اختیار سے ملکی معیشت کو خاص فائدہ اور استحکام نصیب ہو۔

ایسا نہ تھا کہ اس برادری کے فرزندوں نے علمی زندگی کے دوسرے میدانوں کو اختیار ہی نہ کیا ہو انہوں نے زندگی کے دوسرے

میدانوں کو بھی اپنی ترک تازیوں کی جولاں گاہ بنایا اور تعلیم، انتظامیہ عدلیہ، ادب، صحافت وغیرہ کے شعبوں میں خدمات انجام دیں اور اعلیٰ ترین مناصب حاصل کئے اور اپنی علمی و عملی اور ذہنی و فکری صلاحیتوں سے ملک اور قوم کو بیش از بیش فائدہ پہنچایا لیکن جو امتیاز و اختصاص ان کو تجارت کے میدان میں تھا، وہ کسی اور شعبے میں حاصل نہ ہوسکا۔

دہلی کے پنجابی سوداگروں کو مختلف مسلمان برادریوں اور طبقوں میں ایک اور امتیاز حاصل ہے جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں، اور وہ ہے ان کا دینی ذوق عمل و خدمت۔ مسلمانوں میں دینی ذوق عمل و خدمت کی مثالیں عام ہیں لیکن مسلمانوں کی کسی برادری میں چھوٹے سے لیکر بڑے تک، بچوں سے لیکر بوڑھوں تک اور عورتوں اور مردوں سب میں یکساں اور عام دینی ذوق پایا جاتا ہے تو وہ یہی دہلی کے پنجابی سوداگروں کی برادری ہے۔ دینی احکام پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر عمل کرنا دینی تقریبات کے اہتمام میں حصہ لینا۔ دینی مدارس اور دینی خدمت کے دیگر اداروں کو بے لوث خدمت گزاری اور دامے، درمے، قدمے سخنے ان کی سرگرمیوں میں شریک ہونا، ان کا ہمیشہ امتیاز رہا اور بحیثیت مجموعی یہ خوبی ان میں آج بھی نمایاں ہے۔

لیکن جیسا کہ ہمیشہ عملی کام میں حصہ لینے والوں کی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں اور مال و دولت کے ایثار سے قوم کی تاریخ بناتے ہیں۔ لیکن تاریخ لکھنے کی طرف ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی، دہلی کے پنجابی سوداگروں کی یہ برادری بھی کئی سو سال سے قوم کی عظیم الشان خدمت انجام دے کر اپنی تاریخ صفحہ دہر

پر ثبت کر رہی تھی لیکن اسے ابھی تک کوئی مورخ نہ ملا تھا جو صفحہ دہر پر ثبت شدہ ان نقوش کو کاغذ کے صفحات میں بھی مرتسم کر دیتا، تاکہ تاریخ تعلیم کے شائقین، تاریخ سماجی و سیاسی کا ذوق رکھنے والوں، قومی اصلاح کے مجاہدوں کو بھی ان کی عظیم الشان خدمات کا علم ہوتا اور اس کے مطالعے سے برادری کے نوجوانوں میں بھی ایثار و خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا اور اپنے اسلاف کی طرح ان میں بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی خوبی پیدا ہوتی۔ بارے شیخ عطاء الرحمٰن صاحب کو برادری کی تاریخ اور وقت کی ایک اہم علمی ضرورت کی طرف توجہ ہوتی اور انہوں نے پوری کوشش اور تلاش و تحقیق کے بعد ایک تاریخ مرتب کر دی۔

شیخ عطاء الرحمٰن صاحب اسی برادری کے ایک قابل فخر فرزند ہیں اور موجودہ زمانے میں برادری کے ایک بزرگ ہیں وہ اگرچہ عام معنوں میں علم و تحقیق کے آدمی نہیں لیکن برادری سے ان کا عشق اور تاریخ سے ان کی دلچسپی ان کی رہنمائی اور انہوں نے تاریخ و تذکار کے قدیم و جدید لٹریچر کو کھنگال کر اور واقعات کا ریزہ ریزہ جمع کر کے مناسب ضخامت کی ایک تاریخ مرتب کر دی اور علمی اور تاریخی پہلو سے ایک بڑی کمی جو چلی آ رہی تھی اور جسے بہت پہلے پورا ہو جانا چاہیئے تھا، اپنے ذوق اور عزم و ہمت سے پورا کر دیا۔

یہ دہلی کے پنجابی سوداگروں کے تاریخی سفر کے نشیب و فراز ان کے سماجی و معاشرتی خصائص، ذوق و خدمات کے تذکرے اور

قدیم ایام سے لیکر موجودہ دور تک برادری کی تاریخ، خدمات اور خصائص کی مرتب و مفصل تاریخ ہے۔

دہلی کے پنجابی سوداگروں کی تاریخ پر یہ پہلی تصنیف ہے اگرچہ ایک نکتہ چین ذہن کو اس کے ذوق کی تسکین کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اور لبعد میں خواہ اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع تالیف پیش کردی، لیکن اس کی اوّلیت کا ہمیشہ برقرار رہے گا جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ شیخ عطاء الرحمٰن صاحب شمسی علم و تحقیق کے میدان کے مرد نہیں، اس لئے تالیف و تدوین اور زبان و اسلوب بیان کی وہ خوبی اس میں تلاش نہیں کرنی چاہیے جو ایک مشاق قلم اور صاحب طرز ادیب اور مورخ میں ہوتی ہے۔ اس کی اصل خوبی دہلی کے پنجابی سوداگروں کی برادری کے بارے میں تاریخی مواد کی یکجائی و فراہمی ہے اس پر نظر چاہیے اور ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے یہ کام سرانجام دیکر نہ صرف برادری پر احسان کیا ہے بلکہ وہ علم و تاریخ میں بھی ایک مفید اضافے کا موجب ہوئے ہیں۔

ابوسلمان شاہجہان پوری

چیئرمین

مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

ایک دلچسپ کتاب

کسی بھی کتاب پر صحیح رائے دینے کا حق تو اسی وقت ادا ہوتا ہے جب اس کتاب کا مطالعہ مکمل طور پر کیا جائے اور اس کے محاسن کے ساتھ ساتھ ان خامیوں کو بھی اجاگر کیا جائے جو نادانستگی میں رہ گئی ہیں تا کہ آئندہ ان خامیوں کا اعادہ نہ ہو لیکن بدقسمتی سے میں اس کتاب کو وقت کی کمی کے باعث تفصیلی طور پر نہیں پڑھ سکا البتہ اس کا پیش لفظ اور مقدمہ بغور پڑھا جو درحقیقت اس پوری کتاب کو سمجھنے میں ممد و معاون ہی نہیں بلکہ اس کتاب سے ہٹ کر بھی ان کی انفرادی حیثیت ہے اس کتاب کے جستہ جستہ مطالعہ کے دوران میں اس رائے پر پہنچا ہوں کہ:

۱۔ بظاہر تو یہ کتاب ایک مخصوص برادری کا تذکرہ ہے لیکن حقیقتاً اس کتاب کا مطالعہ ایک عام قاری کے لئے مفید دلچسپ اور پُر از معلومات ثابت ہوگا۔ اور یہ کہ اس کتاب کو لکھ کر مصنف نے صرف اپنی برادری کا ہی تعارف نہیں کرایا بلکہ اس کتاب کے ذریعہ ہمارے ماضی کے بعض گم شدہ گوشوں کی طرف نشاندہی کی ہے۔

۲۔ اس کتاب میں غیر جانبدارانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔

جکی طرف جناب توقیر صدیقی صاحب نے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں ذکر کیا ہے اور جو اصول تاریخ نگاری کے لئے ضروری تصوّر کئے جاتے ہیں۔

۳ ــــــ اس کتاب میں حکایات و روایات کو اسی طرح پیش نہیں کیا گیا بلکہ ان حکایات کو درایات کی کسوٹی پر کس کر ان کی صداقت ثابت ہونے پر کتاب کا جزو بنایا گیا ہے اور اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اپنے مشن میں پوری طرح کامیابی حاصل کی ہے۔

مختصر یہ کہ یہ ایک کامیاب کوشش ہے جس میں عالمانہ اور مورخانہ زندگی بھی ہے اور شگفتگی بھی ہے جس میں معلومات بھی ہیں اور تاریخی حقائق بھی اس طرح یہ کتاب اس مخصوص برادری کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوتی ہے اور اسے عوام الناس میں ضرور مقبولیت حاصل ہو گی۔

از قمر چشتی

فلاح و خیر کے امور انفرادی سطح پر تو باعث ثواب ہوتے ہیں لیکن اگر انہی امور کو اجتماعی سطح پر انجام دیا جائے تو اس کے دائرۂ کار میں بہت وسعت پیدا ہو سکتی ہے جمعیت پنجابی سوداگران دہلی بھی ایسی ہی جماعت ہے کہ جو اجتماعی فلاحی امور پر یقین رکھتی ہے۔ اس برادری نے مختلف شعبہ ہائے حیات مثلاً طبّی امور، تعلیمی امور، معاشرتی امور ثقافتی امور وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس انجمن کا ایک خبرنامہ سوداگر کراچی سے نکلتا ہے اور ایک خبرنامہ قوم راولپنڈی سے۔ ان خبرناموں میں شامل مضامین سے اس قوم کے اکابرین کے حالات و کارنامے اجاگر ہوتے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں یادرفتگاں کے عنوان سے پنجابی سوداگران کے رجال کا مبسوط تذکرہ شائع ہوا تھا۔ لیکن اس میں خاندانی یا ذاتی روایتوں پر اعتبار کیا گیا۔ اور علمی و تاریخ سے رجوع نہیں کیا گیا۔ نتیجتہً اس ضخیم کتاب سے جو مقاصد حاصل ہونے چاہیئے تھے وہ نہ ہو سکے۔ اب اس برادری کے ایک فرزند شیخ عطاء الرحمٰن الشمسی نے دلی کے پنجابی سوداگران" ایک جائزہ" کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے۔ میں نے اس کتاب کو جستہ جستہ دیکھا، اس کتاب میں فاضل مصنف نے اپنے طور پر خاصی محنت کی ہے۔ پہلا اور دوسرا باب بہتر ہیں لیکن اگر معاصر تواریخ و تذکروں سے رجوع کیا جاتا تو مزید بہتر ہو سکتے تھے۔ تیسرا باب دلی کی عمارتوں اور بازاروں کے بیان میں ہے۔ دلی کی عمارتوں پر سرسید کی آثار الصنادید ہنوز معتبر ترین سند ہے اور اس پر باوجود کوشش کے مولوی بشیر الدین احمد بھی اپنی کتاب واقعات دارالحکومت دہلی میں بہت کم اضافے کر پائے ہیں۔

شیخ عطاءالرحمٰن شمسی صاحب نے دلی کے بازاروں پر جو کچھ لکھا خاصا ہے۔ اور اس موضوع پر نئی معلومات کا حامل ہے اگر شیخ صاحب اس موضوع کو مزید وسعت دیں تو بہت سے خفتہ گوشے سامنے آسکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب مصنف کی اولین کاوش کے طور پر غنیمت کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر ظفر اقبال
شعبہ اردو (کراچی یونیورسٹی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ الجامعہ — کراچی یونیورسٹی، کراچی

مورخہ ۲ / جنوری ۱۹۸۶ء

پیـــــغام

خداوند تعالیٰ کی تخلیق کردہ کائنات میں انسان مختلف قوموں، گروہوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ ذرائع ابلاغ نے دنیا کو سکیڑ کر ایک قصبے میں تبدیل کردیا ہے، آج بھی قومی، لسانی، گروہی اور برادری کی تفریق قائم چلی آرہی ہے۔ گروہوں اور برادریوں کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق و اختلاف کے جہاں چند نقصانات ہیں وہیں اس کے دوررس فوائد بھی ہیں۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب اس تفریق یا شناخت کی بنیاد مثبت اصولوں پر قائم ہو۔ برادری کے نتیجے میں آپس کے میل جول، محبت و یگانگت، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونے کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور انسانی رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔

دہلی کے حوالے سے انجمن پنجابی سوداگران کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ عطاالرحمن صاحب کھلونے والے نے، جن کا تعلق خود اس انجمن سے ہے، نہایت محنت سے دلّی کے پنجابی سوداگران کی تاریخ مرتب کی ہے جو اس اعتبار سے یقیناً لائق ستائش ہے کہ اس موضوع پر یکجا شکل میں کوئی وقیع مواد دستیاب نہیں تھا۔ عطاالرحمن صاحب کا انداز نظر محققانہ اور اسلوب تحریر دلچسپ اور شگفتہ ہے۔ میں اس قابلِ ذکر کتاب کی تالیف پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

جمیل جالبی
(ڈاکٹر جمیل جالبی)

ایک وضاحت

کیا اپنے ناموں کے ساتھ شمسی لاحقہ لگانا گناہ ہے؟

اس مسئلہ پر برادری میں دو مکتب فکر پائے جاتے ہیں۔ الف وہ جو اس لفظ کے استعمال کو گناہ تصور کرتا ہے۔ ب۔ وہ جو نہ صرف اس کے استعمال کو جائز خیال کرتا ہے۔ بلکہ اپنے نام کے ساتھ بطور ایک جزا پنائے ہوئے ہے۔

الف۔ اس مکتبۂ فکر کی وکالت کرتے ہوئے شیخ نسیم احمد باغبتی نے تاریخ قوم پنجابی سوداگران کے صفحہ ۷۰ پر لکھا ہے۔

ہر پہلو سے عقیدت اور اسلامی نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ سے جانچنا اور پرکھنا انتہائی ضروری ہے کہ کیا کوئی مسلم جماعت یا برادری کو کسی نوع بھی "شمسی" برادری یا جماعت کہلوانا مناسب وا یا جائز ہے؟

اولاً جیسا کہ قبل اس مضمون میں بحوالہ تاریخ فرشتہ بیان کیا گیا ہے کہ فرقہ (شماسین (یعنی شمسیوں کا فرقہ) صدیوں قبل یعنی فتح شاہ کے زمانے میں نہایت ہی بے ہودہ اور مشرکانہ عقائد کے ساتھ شمس الدین نامی شخص نے عراق آکر جاری کیا تھا۔

دوئم یہ کہ موجودہ زمانہ میں اسمٰعیلیہ ہندوؤں کا لاکھوں افراد پر مشتمل "شمسی" نامی جماعت پنجاب میں ہے اور تقریباً چار سو سال سے شمس الدین تبریز سبزواری ملتانی تپ ریز کی زیر تبلیغ چلا آ رہا ہے اور ساتھ کے ساتھ "شمسی" ہندوؤں کی جماعت امام شاہی فرقہ کی بھی کچھ کیفیت مذکور ہوئی ہے۔

پس ان ہر دو مذکورہ مشرکین کی "شمسی" نامی جماعتوں یا فرقوں کے ناموں کی مماثلت و مشابہت کے ساتھ شرک کے خوف سے کسی مسلم برادری یا جماعت کو "شمسی" برادری یا جماعت سے منسوب کرنا حضرات شمسیان کے لئے (فارسی اور اردو میں شمس کی جمع شمسیان اور عربی میں شماسین

ہے غور و فکر کا مقام ہے باری تعالیٰ اپنی رحمت سے ہر مسلمان کو شرک سے بچائے آمین۔ سرکار دو عالم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ "من تشبہ بقوم فھو منھم" جس نے قوم کی مشابہت کی وہ ان میں سے ہوا یعنی ان میں گردانا گیا۔

ب۔ اس مکتب فکر کا کہنا ہے۔

(۱) شمس عربی زبان کا لفظ ہے اور قواعد کی رو سے اسم معرفہ ہے جس کی جمع نہیں ہوتی۔ لہٰذا جمع سے متعلق تمام تاویلات بے معنی اور لایعنی رہ جاتی ہیں۔

(۲) شماس۔ یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی قوم ترسا آتش پرست پارسیوں کا سردار۔ (ملاحظہ ہو فرہنگ آصفیہ جلد دوم صفحہ ۱۸۸)

(۳) پیر شمس الدین سبزواری المتوفی ملتان کی شخصیت اور عقائد دونوں ہی مورخین کے درمیان متنازع ہیں۔

(ملاحظہ ہو تاریخ ملتان از مولانا نور احمد فریدی)

چنانچہ بقول اہل فکر و نظر ب۔ اس کے (پیر شمس الدین) لاکھوں عقیدت مندوں کے لئے اپنے مسلک کی حمایت و برتری۔ یا غلط فہمی کی بنا پر کفر کا فتوا صادر کرنا کوئی کار خیر نہیں۔ کیونکہ ہر فرقہ خود کو ناجی تصور کرتا ہے۔

(۴) سرکار دو عالم کے فرمودات میں ارشاد شدہ وعید کا شمسی حضرات شمسی لاحقہ یا شمسی برادری سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ان لوگوں کی جانب اشارہ ہے جو دوسری قوموں کے طور طریقوں پر عمل پیرا ہیں جن میں کم تولنا، جھوٹ بولنا، دعدہ خلافی کرنا۔ شماس۔ لوگوں کی طرح سر پر بالوں کے درمیان کچھ حصہ منڈانا سکھوں کی طرح بے ہنگم طریقے پر داڑھی

مونچھ رکھنا۔ اور تہذیب پدری کی بجائے تہذیب مادری کو اپنانا۔

سود دینا۔ اور لینا۔ سرفہرست ہیں

(تہذیب مادری و پدری سے متعلق تفصیل کے لئے ارمغان وید حصہ دوم مولفہ عبدالرحمٰن آزاد صدیقی مرحوم ملاحظہ فرماویں۔)

(۵) اسلام سے پہلے پوری دنیا میں کفر و شرک کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پوری دنیا اسی میں گمراہ تھی۔ انہی میں ہمارے اسلاف بھی بھٹک رہے تھے۔ ان گم کردہ راہ لوگوں کو اسلام کی جانب راغب کرنے یا بالفاظ دیگر تبلیغی کوششوں کے ضمن میں بہت سی تحریکات و ترغیبات کے سلسلے جاری ہوئے جن میں سے کچھ ناکامی پر منتج ہو کر معدوم ہو گئے۔ کچھ نے کفر و اسلام کے درمیان "پل" کا کام کیا۔ ہمارے اسلاف نے کونسا پل عبور کر کے یا تحریک سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا اور ہم اس مقام پر پہنچے اس کا صحیح احوال تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔

(نوٹ:۔ روایات و قرائن کے ساتھ آثار تاریخ کے مطالعہ سے جو نتیجہ اخذ ہوا۔ میں نے زیر مطالعہ کتاب میں درج کر دیا ہے۔ مؤلف)

دِلّی کے پنجابی سوداگر

پاکستان کی تاجر برادری میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ان کا مرکز مستقر دلّی تھا۔ اگرچہ بسلسلۂ تجارت یہ پورے برّصغیر میں پھیلے ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس برادری نے کراچی کو اپنا مرکز بنایا۔ کراچی کی معاشرتی زندگی میں ان کے اثرات بڑے خوش گوار اور مثبت انداز کے حامل ہیں۔ یہ برادری اصلاح معاشرت، افادۂ خلق اور توسیع خیر کثیر کے اعتبار سے بڑی فعال اور منظم ہے۔ بڑی خوش اسلوبی سے خدمتِ خلق کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اور وطنِ عزیز میں خصوصی وقعت کی حامل ہے۔

عطاء الرحمٰن صاحب کھلونے والے نے جو اس برادری کے ایک معزز رکن ہیں، اپنی برادری کی تاریخ بڑی محنت اور دیدہ وری کے ساتھ مرتب کی ہے۔ چار ابواب پر مشتمل اس مختصر لیکن بھرپور جائزے میں پنجابی سوداگر برادری کی تاریخ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی

ہے۔ عطاءالرحمٰن صاحب نے بے شمار ماخذ سے استفادہ کیا ہے اور بڑا جامع مرقع تیار کیا ہے۔ اس تاریخ کی نمایاں خصوصیت معروضی انداز اور مورخانہ دیانت ہے۔ تاریخ کو تاریخ کی طرح مرتب کیا گیا ہے۔ فسانہ یاران کہیں بنانے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اس کی پوری گنجائش تھی۔

"دلّی کے پنجابی سوداگر" کا دوسرا اور تیسرا باب بڑا دلچسپ ہے۔ اور معلومات افزا ہے۔ پنجابی سوداگران کی معاشرت اور دلّی میں ان کے سکونتی مراکز کی تفصیل آج کے قاری کے لئے بھی اتنی ہی مفید ہے جتنی کل کے قاری کے لئے ہوگی۔ یہ تالیف اپنی افادیت معلومات اور علمی انداز کی وجہ سے حوالے کی ایک مستند کتاب شمار کی جائے گی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

مشیر علمی و ادبی

انجمن ترقی اردو پاکستان